قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان ۴۸/- روپے غیر ممالک ۱۱۰/- روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۹	دسمبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۱۲-

فہرست

۱۔ لمعات (قوم اور اُمّت) ——— ۲

۲۔ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ عظیم کے آئینے میں۔ (محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۹

۳۔ رشوت، کیوں، کیسے نہیں! (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب) ——— ۱۷

۴۔ اقبالؒ اور قرآن۔ (محترم پرویز علیہ الرحمۃ کا ایک مبسوط خطاب ——— ۲۵

۵۔ حقائق و عبر: (۱) دستور کمیٹی اور مولانا مودودی (۲) افغان مجاہدین ——— ۵۳

(۳) اہلحدیث اور جماعتِ اسلامی (۴) افیدن اور جماعتِ اسلامی

(۵) جماعتِ اہلسنت اور شریعت بل (۶) شریعت بل اور بریلوی علماء!

۶۔ مطالب الفرقان (قسط دوم) (علامہ پرویز علیہ الرحمۃ) ——— ۵۷

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

لمعات

قوم اور اُمّت

ہمارا دور بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں لوگ مسلمان ہونے کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے (فروعات نہیں بلکہ) مسلّمات سے انکار بھی کرتے ہیں۔ انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس انکار پر اصرار کرتے ہیں، اپنے اس انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث بھی کرتے ہیں۔

۲۔ اسلام کے بنیادی مسلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پوری نوع انسان کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے اور اس تقسیم کا معیار کفر اور ایمان ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا ـــــ اس معیار تقسیم و تفریق کی رُو سے دنیا میں بسنے والے تمام مسلم ایک گروہ کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسرے گروہ کے افراد۔ اسی کو (دورِ حاضر کی اصطلاح میں) دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے، دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔

جب ہم اس قرآنی نظریۂ تقسیم کو پیش کرتے ہیں تو اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (مثلاً) پاکستان اور افغانستان میں دو الگ الگ قومیں نہیں بستیں۔ یہ ایک ہی قوم ہے اور اس سے آگے یہ کہ پاکستان اور افغانستان کیا، اس نظریہ کی رُو سے، تمام مسلم ممالک میں بسنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ اور یہ بات خلافِ حقیقت ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ اور چونکہ وہ الگ الگ قومیں ہیں، اس لئے اس سے واضح ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک نہیں، وطن کا اشتراق ہے۔ لہٰذا، یہ دعوےٰ غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراق ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے، معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپکو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں، اسلئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔

یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن کریم کی نصِ صریح کی رُو سے، معیارِ قومیت کفر اور اسلام کا اختلاف ہے۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا عمل اس کے خلاف ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رُو سے معیارِ قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔ ذرا اس دلیل کو آگے بڑھائیے اور دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے! قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ ..... الخ (۳۰/۳۱-۳۲)

مسلمانو! تم اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔

اور آپ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ نہیں! چونکہ مسلمانوں میں ہر جگہ فرقے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں فرقہ سازی شرک ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم میں ہے کہ

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

اور آپ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی اسلامی مملکت بھی ایسی نہیں جہاں حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

یہ ہے منطقی نتیجہ اس دلیل کا چونکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں معیار قومیت، ایمان کا اشتراک ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک غلط اور صحیح معیار، مسلمانوں کا موجودہ عمل ہے نہ کہ قرآن کریم کا فیصلہ۔ اس دلیل کا بودہ پن کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، نوع انسان کے دو ہی گروہ ہیں۔ کافر اور مومن۔ سوال یہ ہے کہ اس معیارِ تقسیم کی رُو سے ایمان کے اشتراک کی بنا پر "جو گروہ" وجود میں آتا ہے اس کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے وہ کہتا ہے کہ۔

(۱) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم نوعِ انسان کے اعمال کے نگران ہو اور رسول تمہارے اعمال کا نگران رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح جو امت وجود میں آئی تھی وہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی یا ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس آیت میں جَعَلْنٰكُمْ اور عَلَيْكُمْ میں (كُمْ) کی ضمیر کا اطلاق کسی خاص وطن کے مسلمانوں پر ہوتا تھا یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس میں شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کا فریضہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کا تھا یا کسی خاص خطۂ ارض میں بسنے والے مسلمانوں کا! اس میں رسول کی نگرانی کسی خاص ملک کے مسلمانوں تک محدود تھی یا ساری دنیا کے مسلمان اس کے احاطہ میں آجاتے تھے! فرمائیے اس میں کون سا جزو تھا جو کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کرتا تھا۔ اس آیت کی رُو سے خدا نے ایک اُمت متشکل کی تھی۔ اُمم متشکل نہیں کی تھیں۔ اس نے کہیں بھی امتِ عربیہ، امتِ مصریہ، امتِ ایرانیہ، امتِ عراقیہ وغیرہ نہیں کہا تھا۔

(۲) اسی نے دوسری جگہ کہا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ..... (۳/۱۰۹) تم ایک بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے كُنْتُمْ (تم) کی ضمیر کسی خاص خطۂ زمین کے مسلمانوں کیلئے ہے یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے! یہ جو

الناس کی منفعت کے لئے اُمت کی تشکیل کی گئی تھی وہ کسی خاص وطن میں محصور تھی یا ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی ؟

(iii) قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بناء پر جو اُمت وجود میں آتی ہے، وہ مکان کے اعتبار ہی سے حدود فراموش نہیں ہوتی، زمان کے اعتبار سے بھی قیود ناآشنا ہوتی ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں مختلف ممالک میں بسنے والے مومن، ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں بلکہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے دنیا میں جب اور جہاں بھی ہو گزرے ہیں، وہ سب ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے حضرات انبیاء کرام کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲ ؛ ۲۳/۵۲) یہ سب ایک ہی امت تھے، اور ان کے ایک اُمت ہونے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی خدا کی محکومیت اختیار کیئے ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ چونکہ اُمت کی تشکیل اس کے نبیؐ کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم نے جو مختلف انبیاء کرام کا ذکر کر کے انہیں اُمتِ واحدہ قرار دیا ہے تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ ان کے متبعین ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی خطۂ زمین کے، ایک ہی زمانہ کے مومن ہی ایک اُمت نہیں، اس اصول کو ماننے والے، شروع سے آجتک، ایک ہی اُمت کے افراد ہیں۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس اُمت کا نام بھی شروع سے آج تک ایک ہی رہا ہے۔ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (۲۲/۷۸)۔ اس نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام رکھا گیا ہے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ سے لے کر آج تک جن لوگوں نے بھی ایمان کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا وہ امتِ مسلمہ کے افراد قرار پا گئے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کس زمانے میں گزرے ہیں اور کون سے ملک میں بستے تھے۔

(iv) قرآن کریم نے انہیں امت کہہ کر نہیں پکارا وہ ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب اِخْوَةٌ (بھائی بھائی) ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ

تم حبل اللہ (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ اور یوں اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ (۳/۱۰۳)

ظاہر ہے کہ اس رشتۂ اخوت سے کسی ایک وطن کے مسلمان ہی پیوست نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان منسلک ہیں اور یہ رشتہ، اعتصام بہ حبل اللہ (قرآن سے وابستگی) یا ایمان سے جیسا کہ دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) حقیقت یہ ہے کہ (کسی ایک خطۂ زمین کے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے) مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخوت کا رشتہ، قومیت کے رشتہ سے کہیں زیادہ عمیق اور مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ جس کا مطلب واضح ہے کہ اخوت کے اس رشتہ کی بنیاد، ایمان کا اشتراک ہے۔ جو لوگ ایمان میں ان سے مشترک نہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اس میں داخل ہونا چاہیں تو وہ صرف ایمان لانے سے ہی ایسا

رسکتے ہیں۔ غور کیجیے عرب کے رہنے والے غیر مسلم (مشرکین قریش) اور مسلمان، وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان کے اشتراک کے باوجود، ایک امت کے افراد قرار نہیں پا سکے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ..... (۹/۱۱) اگر یہ اپنی موجودہ کفر کی روش سے تائب ہو کر تمہارے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ میں شریک ہو جائیں تو پھر یہ "دین میں تمہارے بھائی" بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کے اور تمہارے درمیان تمام مشترک عناصر (نسل۔ رنگ، زبان، وطن وغیرہ کا اشتراک) انہیں تمہارا بھائی نہیں بنا سکتا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر خونی رشتہ کی بنا پر بھی بعض مسلمانوں کے بھائی تھے۔ یہ دین کے اشتراک کی بناء پر تمہارے بھائی بن سکتے ہیں۔

اور یہ رشتہ اخوت کسی ایک دور کے مومنین تک محدود نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ یہ گزرے ہوئے زمانے کے مومنین تک کو بھی محیط ہے۔ چنانچہ قرآن نے ہر دور کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ ان کی یہ دعا ہونی چاہیئے کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (۵۹/۱۰) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی، جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزرے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایمان کے اشتراک کی بناء پر متشکل ہونے والی امت، کس طرح زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہوتی ہے اور ان میں باہمی رشتہ قومیت ہی کا نہیں ہوتا۔ اس سے کہیں گہرا اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح تعلیم کی موجودگی میں، وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دینے والے "مسلمان"، اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل کیا لاتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجیے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ قرآن نے، ایمان کے اشتراک کی بناء پر امت بنائی ہے۔ قوم نہیں بنائی۔ ایمان کے اشتراک سے امت وجود میں آتی ہے، اور وطن کے اشتراک سے قوم۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، دو قومی نظریہ کے مخالف یہی دلیل لایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان، مذہب کی بناء پر ایک امت ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بسنے کی بناء پر، وہ اور غیر مسلم، سب ایک (ہندوستانی) قوم کے افراد ہیں۔ اس دلیل کی بناء پر وہ کہا کرتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان مذہب کی بناء پر ایک امت ضرور ہیں، لیکن مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کی بناء پر ان کی قومیتیں الگ الگ ہیں۔ اور امت اور قوم کی یہ تفریق درحقیقت مذہب اور دین کی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب میں واقعی یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنا الگ الگ مذہب رکھتے ہیں، لیکن قومیت ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثنویت سیکولرازم کی پیدا کردہ ہے۔ دین میں امت اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی فریب خوردگی یا مغالطہ آفرینی کی وجہ یہ تھی کہ مغرب سے آمدہ نیشن (NATION) کے لفظ کا ترجمہ قوم کیا گیا اور اس کے بعد کہا گیا کہ قرآن نے مسلمانوں کو جداگانہ امت قرار دیا ہے، جداگانہ قوم نہیں قرار دیا۔ مذہب کے اعتبار سے، وہ غیر مسلموں سے الگ امت ہیں۔ لیکن سیاسی نقطۂ نگاہ سے، وہ اور غیر مسلم، مل کر ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہی وہ سیکولرازم یا ثنویت (DUALITY) تھی۔ جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا) اور زمانہ نزولِ قرآن میں قوم کے لفظ نے وہ سیاسی مفہوم اختیار نہیں کیا تھا جو عصرِ حاضر میں مغربی تصوّرِ قومیت کی رُو سے آجکل رائج ہے (وہ تو بلکہ قوم میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اس مقصد کے لئے امّت کا لفظ ہی نہیں قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت و رحمت ہے لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۵۲) ایمان لانے والی قوم کیلئے (دیگر کئی ایک مقامات پر بھی یہ الفاظ آئے ہیں) اسکے برعکس سورۂ یونس میں ہے کہ خدا کی آیات اور تنبیہات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰/۱۰۱) اس قوم کو جو ایمان نہیں لاتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلم اور غیر مسلم کے لئے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ پھر ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحات ہی استعمال نہیں کیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں باہمی تعلقات کس قسم کے ہوں گے۔ غور سے دیکھئے فرمایا

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ..... (۵۸/۲۲)

تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ جو قوم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے۔ وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرے جو خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کی مخالفت کریں خواہ وہ ان کے ماں باپ اولاد، بھائی اور دیگر افرادِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں

یہ ہے ان دونوں قوموں میں اختلاف کی نوعیت! آپ محض اشتراکِ وطن کی بناء پر انہیں ایک قوم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم ایمان کے اختلاف کی وجہ سے، باہمی رشتہ داریوں تک کے تعلقات بھی منقطع کر دیتا ہے۔ ذرا سوچیے! کہ اس کے بعد ان دو متضاد نظریاتِ زندگی کے حامل افراد، ایک قوم کے افراد بن سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، ہر غیر مسلم "خدا اور رسول" (اسلامی نظام) کا مخالف ہوتا ہے۔ کافر مومن کا ایک قوم کے افراد قرار پاتا تو ایک طرف اقوامِ مومنین کو دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲/۲۸۶) ہمیں کافرین پر غلبہ و نصرت عطا فرما۔ فرمایئے! سینہ میں اس قسم کی آرزوئیں رکھنے اور ان کا اس طرح اعلان کرنے والے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں!

(۰)

اس سلسلہ میں ایک دلیل اور بھی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر ایک مومن سہواً اور نادانستہ کسی مومن کو قتل کر دے تو اس کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ قرآن نے اس خون بہا کی ادائیگی کا طریق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ...... (۴/۹۲) اگر مقتول مومن ہو لیکن اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہاری عداوت ہے تو پھر دیت یوں دی جائے گی اور اگر اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہارے معاہدانہ تعلقات ہیں تو پھر اس طرح ......" اس سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ دیکھیے قرآن اس کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک مومن، اس قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ

تمہارے دشمنی کے تعلقات ہوں یا میثاقی تعلقات۔ یہ قوم بہر حال غیر مسلموں کی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان، غیر مسلموں کی قوم کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ دلیل، یونہی سمجھیے، جیسے کوئی شخص ہاتھی گزارنے کے لئے تنکوں کا پل بنائے۔ ایسا کہنے والے یہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ وہ حالات کیا تھے جن میں قرآن نے ایسا کہا تھا؟ ابتدائے اسلام میں کیفیت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں اکا دکا لوگ ایمان لے آتے تھے۔ وہ مسلمان تو ہو جاتے تھے لیکن رہتے تھے اپنے قبیلہ ہی میں۔ ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ خود مکہ کے مسلمان، اسی مکہ میں اسی قوم قریش میں رہتے تھے، اور مدینہ کے مسلمان بھی مدینہ کی مخلوط آبادی کے افراد تھے۔ یہی کیفیت مختلف قبائل میں رہنے والے مسلمانوں کی تھی۔ مندرجہ بالا آیت میں دیت کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ ایسے ہی مسلمانوں کے متعلق ہیں۔

اس کے بعد جب ایک ایسا مقام میسر آگیا جہاں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن تھے۔ (یعنی مدینہ) تو مکہ کی جماعت ہجرت کر کے وہاں منتقل ہو گئی۔ جب وہاں اپنی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے ان سے کہہ دیا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان میں بعض ایسے تھے جنہیں دشمنوں نے اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہیں اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیکر کہا گیا کہ وہ انتظار کریں تا آنکہ ان کے وہاں سے منتقل کرانے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس دوران میں ان کی ہر ممکن اعانت اور خبر گیری کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جو وہاں سے نکلنے کے لئے ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے تھے۔ لیکن بامرِ مجبوری ایسا کر نہیں پا سکتے تھے (۴/۹۷، ۴/۹۸) اور یہی تھے جنہیں وہاں سے نکالنے کے لئے آخر الامر مملکتِ اسلامیہ کو جنگ کا حکم دیا گیا۔ (۴/۸۹)

کچھ لوگ (مسلمان) ایسے بھی تھے جنہیں ہجرت کے امکانات حاصل تھے لیکن وہ وہاں سے آنا نہیں چاہتے تھے یہ وہ لوگ تھے جنہیں آپ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں) "متحدہ قومیت" کے حامی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ "مذہب" کی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی حیثیت وطنی یا نسلی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق کیا کہا؟ یہ کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں کہ یہ جس طرح خود دعویٰ ایمان کے باوجود کافر کے کافر رہنا پسند کرتے ہیں، تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ..... (۴/۸۹) انہیں کبھی اپنا دوست نہ سمجھو تا وقتیکہ یہ وہاں کے لوگوں سے قطع تعلق کر کے تمہارے ہاں نہ آجائیں اور اگر یہ یہاں آنے کے بعد پھر اپنی سابقہ قومیت کی طرف پلٹنا چاہیں تو ان سے بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح دوسرے دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے (۴/۸۹) اس سے ذرا آگے جا کر کہا کہ موت کے وقت ان لوگوں سے ملائکہ جا کر پوچھیں گے کہ تم ان لوگوں میں کیوں رہے، تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم کیا کرتے ہم مجبور تھے۔ جواب دیا جائے گا کہ تم مجبور کیوں تھے! خدا کی زمین وسیع تھی اور تمہیں نقلِ مکانی کے امکانات حاصل تھے پھر یہ عذر کیسا؟ چنانچہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ (۴/۹۷)

ہم ان حضرات سے، جو یہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ اشتراکِ وطن کی بناء پر

غیر مسلموں کی قوم کا فرد بن کر رہ سکتا ہے، یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں کہ جن مسلمانوں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور مسلمان رہنے میں انہیں کسی قسم کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کون سی بات تھی جس کی بناء پر قرآن انہیں جہنمی قرار دے رہا ہے اور مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ ان سے دوستانہ تعلقات ہرگز روا نہ رکھیں، اور اگر وہ اپنی روش پر اصرار کریں تو ان سے جنگ بھی کریں بات صرف اتنی تھی کہ وہ (ان حضرات کے تصوّر کے مطابق) اُمّت اور قوم میں فرق کرتے تھے۔ وہ اُمّت کے اعتبار سے مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن قومیّت کے لئے وطن یا نسل کو معیار قرار دیتے تھے۔ یہ وہ ثنویت تھی جس کی بناء پر قرآن انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ ہے معیارِ قومیّت کی اہمیّت قرآن کی رُو سے جسے آج کل محض ایک سیاسی مسئلہ تصوّر کر کے درخورِ اہمیّت ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اب رہا یہ سوال کہ آج کل ساری دنیا کے مسلمانوں نے وطن یا نسل کو معیارِ قومیّت قرار دے رکھا ہے۔ دین، معیارِ قومیّت کہیں نہیں، تو یہ مسلمانوں کا تصوّر ہے قرآن کا نہیں۔ تحریکِ پاکستان کا مقصود یہ تھا کہ آج جبکہ دنیا میں کہیں بھی اسلام کو معیارِ قومیّت نہیں قرار دیا جا رہا، ایک مختصر سے خطۂ زمین ہی میں سہی، ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کی بنیاد اسلام کے معیارِ قومیّت پر ہو اور جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کیئے جا سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مملکت، اسلام کے احیاء کے لئے ذرۂ اوّلین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے۔ جب اسلامی معیارِ قومیت کہیں عملاً نافذ کر دیا جائے تو پھر اس تجربہ کو آگے بڑھایا جائے اور رفتہ رفتہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی اس راستے پر لایا جائے۔ منتہیٰ اس سکیم کا یہی تھا کہ پھر سے ساری دنیا کے مسلمان امتِ واحدہ (یعنی ایک قوم) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔

لیکن وائے بدنصیبی کہ ہم نے ایک مملکت تو حاصل کر لی لیکن زندگی یہاں بھی قرآنی قالب میں نہ ڈھل سکی۔ ہمارے لبوں پر الفاظ تو دو قومی نظریہ کے رہے لیکن عملاً معیارِ قومیّت، وطن کا اشتراک ہی رہا۔ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایمان کے اختلاف و افتراق کی بناء پر، دو قومیں نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کی بناء پر ایک ہی قوم تسلیم کیئے جاتے ہیں۔ یہ حالت ان کی ہے (جو زبان ہی سے سہی، بہرحال) دو قومی نظریہ کے حامی ہیں جو لوگ تقسیم سے پہلے، وطن کے اشتراک کی بناء پر قومیّت کے قائل تھے، یہاں آکر ان کا "کفر" پہلے سے بھی زیادہ متشدد اور اجدر ہو گیا۔ یعنی وہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے، لیکن یہاں خود مسلمانوں کو چار قومیّتوں پر تقسیم کر رہے ہیں! یا اللعجب۔ یعنی ہندوستان میں وطن کے اشتراک کی بناء پر، مسلم اور غیر مسلم ایک قوم، اور یہاں اسی اشتراکِ وطن کے باوجود، خود مسلمانوں کی چار قومیں! اور اس پر اصرار یہ کہ یہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ مطابقِ اسلام تو ایک طرف، یہ تو خود ان کے نظریۂ قومیّت کے بھی مطابق نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ایک ملک کے باشندے ایک قوم تو قرار پاتے ہیں۔ اپنی اس روش (چار قومیتوں) کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو اُمّتِ واحدہ قرار دیتا ہے، واحد قوم نہیں قرار دیتا۔ مسلمان خواہ چار چھوڑ چار سو قوموں میں بھی منقسم ہو جائیں، ان کی اُمّت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ یہ "اُمّت کی وحدت" ہے کیا بلا جو اختلافِ قومیّت کے باوجود بدستور قائم رہتی ہے۔ اور اس کا

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۱۶) پر ملاحظہ فرمائیں)

خیر البشر قرآنِ عظیم کے آئینے میں

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے۔ جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر ۔ بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

(معراجِ انسانیت از پرویز)

قرآن کریم نے سب سے پہلے نبی اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷) "ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔" نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے محنت کر کے حاصل کر لے۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ جس انسان کو اس خصوصیت سے نوازا جانا منشاءِ خداوندی ہوتا۔ اس کی تربیت آغاز سے ہی اللہ تعالیٰ کے زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ شخص نہیں جانتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ غلط باتوں سے دور رہتا اور باطل کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ جیسا کہ خدا نے مذکورہ آیت میں نبی کریمؐ کی کیفیت بیان کی ہے۔ پھر اس ذاتِ گرامیؐ پر خدا کی وحی نازل ہوئی جسے خدا نے اس منصب کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ یوں اسی متلاشیٔ حقیقت کو نبوت عطا ہوئی اور اسے وہ کچھ سکھا دیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ وہ جو یتیم بھی تھا اور غریب بھی اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى (۹۳/۶) اور نبوت سے پہلے ان پڑھ بھی۔ (۷/۱۵۸) ربِّ ذوالجلال نے اپنے اس منتخب و محبوب بندے کو خاتم النبیینؐ اور رحمۃ للعالمین بنا کر تمام بنی نوعِ انسان کو رہبرِ کامل عطا کیا۔ منصبِ نبوت پر سرفراز کیئے جانے کے بعد نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ يَاۤ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ اے وہ کہ جس کے ذمے نظامِ عالم کو درست کرنا ہے۔ قُمْ ۔ اٹھ ۔ فَاَنْذِرْ اور لوگوں کو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۳) اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہ وہ دعوتِ حقانی تھی جس میں انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط الٹ کر جدید نظام یعنی نظامِ خداوندی قائم کرنا

تھا۔ باطلِ حق کو کیونکر برداشت کرتا۔ مخالفت ہر طرف سے ہوئی۔ آسمانی انقلاب کے اس داعی سے کہا گیا۔ اس دعوت کا آغاز اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴) اے رسولؐ! اپنے قریبی رشتہ داروں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو۔ اس کے بعد آگے بڑھو اور سارے اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ۔ ۶/۹۲ اور پھر یہ سلسلہ اس طرح بڑھتا چلا جائے کہ تمام نوعِ انسانی اس کی آغوش میں آجائے۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸) "نوعِ عالم انسانیت کو پکار کر کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسولؐ ہوں" یہ دعوت صرف خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت تھی۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹) اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یہ دعوت محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے، مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے اور ان زنجیروں کو توڑنے کی دعوت تھی جن میں ناتواں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی (وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۷/۱۵۷) اس کے ساتھ ہی یہ دعوت دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار و ذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ ان کا رسولؐ کی مخالفت میں محاذ بنانا یقینی تھا۔ یہ تھے اربابِ حکومت۔ مذہبی پیشوا۔ سرمایہ دار وغیرہ وغیرہ۔ قرآن انہیں مستکبرین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ اس طبقہ نے ہر دور اور ہر زمانے میں اس دعوتِ حق کی مخالفت کی (۳۴/۳۴) چنانچہ نبی اکرمؐ کو بھی اس طبقہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دشمنانِ دین نے حق کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ آزمایا۔ کبھی رسولؐ کو ساحر و کذاب بنایا تو کبھی شاعر و مجنوں اور کہا کہ یہ جو کچھ پیش کرتا ہے یہ وحی نہیں یہ تو انسانی کلام ہے۔ کبھی عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ تم اس قرآن کو مت سنو لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اس کی تعلیم دی جا رہی ہو وہاں شور مچا دو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اسی نئی تحریک پر غالب آسکو۔ یہ لوگ دوسروں سے کہتے تھے کہ دیکھو یہ کیسا رسول ہے جو عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ اردو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کو تو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیئے۔ اس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہونا چاہیئے۔ توہم پرستی کے اس دورِ جاہلیت میں ان بڑے لوگوں کے بہکانے میں عوام کا آجانا فطری بات تھی۔ وہ پھر حضورؐ سے اس کا ثبوت مانگتے کہ وہ خدا کے رسولؐ ہیں۔ آپؐ کا بزبانِ وحی ثبوت یہ تھا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویٰ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا یا فریب کار ہوں۔ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہوتی ہے؟ اس گفتۂ حق کا وہ کیا جواب دے سکتے تھے؟ وہ اس کی تردید کر نہیں سکتے کہ اس ذاتِ اطہر و اعظم کو انہوں نے ہمیشہ صادق و امین پایا تھا۔ اس کے باوجود مفاد پرست گروہ کی مخالفت بڑھتی چلی گئی اور وہ اس حد تک پہنچ گئے کہ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۷۲/۱۹ اور جب اللہ کا

یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔ ادھر ان کی مخالفت میں شدت آ رہی تھی ادھر ربّ کریم آپ کو استقامت و استقلال کی راہ پر گامزن رہنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ ۳۸/۱۷ جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں اس پر استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ۳۰/۶۰ تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخر الامر تمہارا مشن کامیاب ہوگا وہ بالکل سچا ہے وَذَکِّرْ بِہٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا کَسَبَتْ ۶/۷۰ اور قرآن کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کرتے رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ ۴۲/۱۵ تو اسی طرح انہیں صحیح نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت اور عزیمت سے اس راہ پر جمارہ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ راہ حق میں ثابت قدم رہنے کا حکم اور تاکید حضورؐ کے ساتھ ان لوگوں کے لئے بھی تھا جو غلط روش کو چھوڑ کر آپؐ سے آن ملے تھے۔ وحی خداوندی کے مطابق نظامِ خداوندی کے پروگرام کی تکمیل کے لئے حضورؐ اور ان کے رفقاء کو دن رات مصروف جدوجہد رہنا تھا۔ جب مخالفین نے دیکھا کہ ان کی اس قدر مخالفت کے باوجود اس جماعت کی تگ و تاز میں بالکل فرق نہیں آیا اور یہ تحریک آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے تو انہوں نے ایک اور حربہ آزمانا چاہا انہوں نے مفاہمت کی پیشکش کی قرآن کے الفاظ میں: وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ (۶۸/۹) ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت برتو (اپنے مقام سے تھوڑا سا پھسل جاؤ) تو یہ بھی مداہنت سے کام لیں۔ اور اس پیش کش کی صورت یہ تھی کہ اس قرآن کی بجائے دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں ہماری حسبِ منشاء تبدیلی کر دو (۱۰/۱۵) آپ سے کہا گیا فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ (۶۸/۸) ان جھٹلانے والوں کی بات ہرگز نہ ماننا۔ وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۱۱/۱۱۳) ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ ان سے کہہ دو کہ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰/۱۵) میں قرآن میں ردّوبدل کیوں کروں میرا منصب اس کا اتباع کرنا ہے جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اتباع نہ کروں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک سخت مصیبت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ ان مخالفین کے بارے میں خدا تعالیٰ کا فرمان ہوا۔ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ وَانْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۱/۱۲۱) ان لوگوں سے جو تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے یہ کہو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو اور ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو اس کے بعد تم بھی

انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ حق و صداقت کی راہ کونسی ہے؟

حق کی دعوت کو قبول کرنے اور حضورؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے لئے عقل و فکر کو جو اہمیت ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی زبانی یوں سمجھایا: اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ میں تم کو صرف ایک بات کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى اور وہ یہ ہے کہ تم زیادہ نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (اور اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر جن میں تم اس وقت اندھا دھند بہے چلے جا رہے ہو) سوچو، غور و فکر کرو۔ (اگر تم نے خالی الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴/۴۶) تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے یہ جو کچھ کہتا ہے بڑی سمجھ بوجھ کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے میں تمہارا ہی بھلا ہے مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ (۲۵/۵۷) میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

قرآن کریم کی روشنی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ رفتہ رفتہ خیر البشر سیدِ عالمؐ کا پیغام ربانی مخاطبین کے دلوں میں اترتا چلا گیا اور طالبانِ حق کی ایک جماعت حضورؐ کی امامت میں تیار ہو گئی۔ اس جماعتِ مومنین کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ یعنی غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معاشرہ کا قیام۔ اس معاشرہ کا قیام جس نے سر تا پا قرآنی اصول و اقدار اور آئین و ضوابط کا پیکر بننا تھا۔ جس میں مفاد پرستیوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ قافلۂ رشد و ہدایت اپنے ہدی خواں کا اتباع کرتا ہوا دن رات سرگرمِ عمل ہوا۔ پھر اس پروگرام کے لئے یہ وحیٔ خداوندی نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (۷۳/۱-۳) راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ نصف شب تک یا اس سے کم و بیش اس لئے کہ ابھی تو آغازِ سفر ہے اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (۷۳/۵) تجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جانے والی ہے اور اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۷۳/۷) دن کے پہروں میں بھی تمہارا پروگرام لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ ادھر اس پروگرام خداوندی میں وسعت آ رہی تھی ادھر دشمنانِ دین کی ایذا رسانیاں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ حضورؐ جو کہ نہایت مشفق تھے، ان مخالفین کے اس رویہ پر کہ جو محض ہٹ دھرمی تعصب اور جہالت کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف لے جا رہے تھے، بہت دکھ محسوس کرتے تھے۔ اور اس شدتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۲۶/۳) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں کہ یہ لوگ حق و صداقت کی راہ کو تسلیم کیوں نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لو گے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵/۸) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲/۴۸) اگر یہ لوگ اس راہ سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تجھے ان کا محافظ

نے نہیں بھیجا تمہارے ذمے بس اتنا ہی ہے کہ تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ (ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اور اپنا راستہ آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اپنا کام ہے) فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (88/21-22) تم انہیں حقیقت کی یاد دہانی کراتے رہو۔ تمہارا فریضہ یاد دہانی کرانا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کیئے گئے۔ پھر وہ وقت آگیا جب سوچ سمجھ کر دل کی رضامندی سے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والے افرادِ جماعتِ مومنین میں شامل ہو گئے اور اس سے انکار کرنے والے الگ ہو گئے کہ حیوانی سطحِ زندگی کو ہی زندگی سمجھنے والے انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کیا کرتے۔ اس مقام پر ارشاد ہوا فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ سو جو شخص ہمارے قوانین سے روگردانی برتتا ہے اور طبعی زندگی کے علاوہ اور کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتا۔ اس سے تم اعراض برتو۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ "ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حرفاً حرفاً ٹھیک تھا۔" تاہم مخالفین نے حضورؐ کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھیں اور ان کی کوشش یہ تھی کہ حضورؐ کو گرفتار کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں۔ ان کی یہ خفیہ تدبیریں تھیں اور خدا اپنی تدبیر کر رہا تھا کہ وہی سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ خدا کی اسی تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے وہاں کی فضا زیادہ سازگار تھی۔ ہجرت کی ہی اس لئے جاتی ہے کہ بہتر فضا میں اپنے پروگرام کو بروئے کار لایا جا سکے۔ مکّہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر دعائیں تھیں۔ (وَقُل) رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا (17/80) اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا۔ اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔" مکّہ سے نکلتے ہوئے آپ کے ہمراہ صرف ایک رفیق ابوبکر صدیقؓ آپ کے ساتھ تھے۔ لیکن بظاہر اس بے بسی کی حالت میں بھی آپؐ کو اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقینِ محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرما رہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (9/40) مت گھبراؤ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ مدینے کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس برادری کی تشکیل ہوئی جو خون۔ رنگ اور وطن کی نسبتوں سے آزاد ہو کر ایک آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ایمان رکھتی تھی۔ اور جس کی صداقت کی گواہی خود اللہ نے دی۔ اس فرمان کے ساتھ۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (8/72) جو لوگ ایمان لائے۔ ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی۔ تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ مکّے والوں نے یہاں بھی حضورؐ کا پیچھا کیا۔ اور اس خوف سے کہ اگر وہ نظام جس کی دعوت حضورؐ دے رہے تھے کسی جگہ قائم ہو گیا تو ان کا اقتدار باقی نہیں رہے گا۔ جماعتِ مومنین پر چڑھ دوڑے۔ اور اب مقابلہ میدانِ جنگ میں ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وحی کے ذریعے جنگ کی اجازت ملی کہ مظلوموں کی خاطر جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ دوسروں پر زیادتی کرنے والوں کی مدافعت نہ کی جائے تو دنیا میں مذہب

کی آزادی ختم ہو جائے۔ مظلوم کو جنگ کی اجازت اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ غالب آکر جو حکومت قائم کرے اس کی صورت اس ارشاد خداوندی کے مطابق ہو۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱-۳۹) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے۔ نوعِ انسانی کی پرورش کا انتظام کریں گے۔ لوگوں کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیں گے اور غیر خداوندی قوانین کی اطاعت سے روکیں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور آخر الامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

یہ نہاد مقصدِ وحید جس کے لئے حضور اکرمؐ نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ قریش سے جنگیں لڑیں۔ پہلا تصادم بدر کے مقام پر ہوا (۳/۱۲۳) مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود رسولِ کریمؐ کر رہے تھے۔ ایمان والے صرف تین سو تیرہ کفار کے ہزار کے لشکر پر غالب آئے اور اپنے گھروں سے کچھ ہی عرصہ پہلے نکالی گئی جماعت فاتح و منصور واپس لوٹی۔ جنگوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک جاری رہا تا آنکہ مکہ فتح ہو گیا اور دینِ خداوندی ہر طرف غالب آگیا۔ اس تمام عرصے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پروگرام خداوندی کے مطابق نظام نو کی تشکیل و تعمیر فرماتے رہے۔ فرائض رسالت کے متعدد گوشے تھے۔ سب سے پہلا حکم یہ تھا کہ جو کچھ آپؐ پر خدا کی طرف سے نازل ہو اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۵/۶۷) دوسری بات لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غائیت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (۶۲/۲) خود قرآن کریم کا اتباع کرنا اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔ اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کے پیچھے نہ چلو۔ فرائضِ رسالت کا عظیم گوشہ تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (۷/۳) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے کے متعلق یہ حکمِ خداوندی نازل ہوا کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۹) جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلے کرو اس لئے کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتے جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔ امورِ مملکت میں مشورہ کا اصول عطا ہوا۔ وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۳/۱۵۹) اے رسول! تو معاملات میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے معاملہ پیش نظر کی سرانجام دہی کے لئے عمل پیرا ہو جا ــــ حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرنے کا حکم ان امور میں دیا گیا تھا جن میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی۔ کیونکہ وحی کے طے شدہ امور میں انسانوں کا مشورہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مشاورتی امور کے قوانین کی روشنی میں عقل و فکر کی رُو سے زمانے کے تقاضوں کے مطابق طے کیے جاتے تھے اور یہ حکم اس لئے تھا کہ انسانوں کی آزادئ رائے اور حریتِ فکر و عمل برقرار رہے۔ لامحالہ اس میں غلطی کا امکان تھا۔ مگر اس کی اصلاح کا اختیار بھی انسان کو حاصل تھا۔ یہ اسی آزادئ فکر کا ثمرہ تھا کہ ایک عورت بھی اپنے معاملہ کے متعلق پوری جرأت سے حضورؐ کے ساتھ بات کر سکتی تھی۔ اور اپنا مؤقف بھی پیش کر سکتی تھی۔ ایسی جرأت کے ساتھ کہ جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِھَا وَتَشْتَکِیْ

إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۵۸/۱) اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے" اور جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اسے طلاق مت دے تو زید نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال نہیں آیا اور نہ ہی مشورہ سے انکار کر دینے والے کو کوئی پشیمانی ہوئی۔ درحقیقت حضورؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ نوعِ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کیلئے ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی جائے۔ تیئیس سال کی مسلسل جدوجہد سے آپؐ نے ایسا آزاد معاشرہ قائم کیا جہاں ہر شخص علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ یوں یہ حقیقت سب پہ واضح ہوگئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ (۳/۷۹) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ (اسے یہی کہنا چاہیئے) کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو اپنے رب کے بندے بن جاؤ"۔ یہی وہ تعلیمِ قرآنی تھی جس کی صداقت کی شہادت میں حضورؐ اپنی بشریت کا بار بار اعلان کرتے رہے۔ (قُلْ) إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (۱۸/۱۱۰) کہو۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔

رحمۃ للعالمین کا مشن پورا ہوا ربّ العالمین نے اعلان کر دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۶/۱۱۶) اور تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی نہیں بدل سکتا اور وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے خدا کی یہ باتیں قرآنِ کریم میں جمع ہوگئیں جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۵/۹) یقیناً ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہمیں اس کے محافظ ہیں۔ حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپؐ کی حیاتِ طبیعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے۔ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (۳۹/۳۰) لیکن حضورؐ کے بعد اس نظام نے جاری رہنا ہے۔ رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷) وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے

کا حکم دیتا ہے جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنہیں قرآن نے ناپسند
ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ فریضہ ان کی امت کا ہو گا۔ جسے خطاب کرکے اللہ فرماتا ہے
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے تمہارا فریضہ یہ ہے
کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر
ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ
عِبَادِنَا ....(۳۵/۳۲) اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ تم رسولؐ کی زندگی کو اپنے لئے بہترین
نمونہ بناؤ؛ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) وہ خیر البشرؐ جو اخلاق
کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ اس کے تتبع میں ہمیں بھی اخلاقِ عالیہ کا حامل ہونا ہو گا کہ حضورؐ
کے نقشِ قدم پر چل کر ہی ہم نظامِ خداوندی کے قیام میں حصہ لے سکتے ہیں۔

جسطرح حضورؐ بھرے مجمع میں مخالفین سے یہ کہتے تھے کہ میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے کیا تم اس سے اندازہ نہیں
لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ اسی طرح ہم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کو اپنے کردار کی سچائی سے منوا سکے گا
ایسے ہی لوگ اس نظامِ خداوندی کی تشکیل کر سکیں گے اور قائم رکھ سکیں گے۔ جس کی زندہ و تابندہ مثال حضورؐ ہمارے لئے
تمام نوعِ انسان کیلئے رہتی دنیا تک چھوڑ گئے ہیں۔　　　(ثریا عندلیب صاحبہ)

(بقیہ لمعات صفحہ (۸) سے آگے)

عمل یا حصل کیا ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جا
ہے۔ یہ تھا وحدتِ امت کا عملی نتیجہ۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کا بلا دریغ
قتلِ عام کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی ملک کے مسلمان نسلی، صوبائی، لسانی حتیٰ کہ سیاسی اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے
کے خون کے پیاسے ہیں، اور اس کے باوجود ان کے امتِ واحدہ ہونے کے "عقیدہ" پر کوئی حرف نہیں آتا

یاد رکھیئے! آج کی اصطلاح میں جو مفہوم لفظ قوم (نیشن) کا ہے، قرآنی اصطلاح میں وہی مفہوم لفظ امت کا ہے
جب اسے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک امت (یعنی ایک قوم) قرار دیتا
ہے اور جغرافیائی یا نسلی اور لسانی اختلافات ان کے ایک قوم ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے
امت اور قوم میں فرق کرنا، خلافِ اسلام ہے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مسلمان مختلف ممالک میں آباد تھے
ان کی نسلیں بھی الگ الگ تھیں اور زبانیں بھی جدا جدا حتیٰ کہ ان کا "کلچر" بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ لیکن اس کے
باوجود، وہ سب ایک قوم (امت) کے افراد تھے۔ ان کی قومیتیں مختلف نہیں تھیں۔ جو حضرات آج کل جغرافیائی یا نسلی
لسانی یا صوبائی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہیں، انہیں اس سے کون روک سکتا ہے، لیکن
ان کی خدمت میں اتنا عرض تو کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت پیدا کریں کہ اپنے اس تصور یا عمل کے
متعلق اعتراف کریں کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے خلاف یا مطابقِ اسلام ہونے کے لئے کوئی خا
معیار ہونا چاہیئے اور مسلمانوں کے لئے وہ معیار کتاب اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ کتاب اللہ کی رو سے سار
دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قوم میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے مسلمات میں

رشوت کیوں، کیسے نہیں!

رشوت آج کا ایک اہم مسئلہ اور چلتا ہوا موضوع ہے، بہت لوگوں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے، حکومت نے بارہا اسے ختم کر دینے کے عزم کا اظہار کیا ہے، سوالنامہ جاری کیا۔ جس پر بہت سے دانشوروں نے اس کا علاج تجویز کیا ہے،

حکومتی سطح پر بیانات کے علاوہ انتظامی اقدامات پر زور دیا جاتا ہے، ماضی میں حکومت نے انٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ بنا کر اس کی اصلاح کی کوشش کی مگر ناکام رہی، مارشل لاء نے اس کی وسعت پذیری کا اعتراف کیا اور اپنے طور پر اس پر کنٹرول کر سکنے سے معذوری کے اظہار کے طور پر اس کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کیا، محتسب اعلیٰ کا منصب قائم کیا مگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے رکھے، میدان محدود — کوئی کرے تو کیا، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق یہ برائی شدت اختیار کرتی گئی۔

گئے وقتوں کے ایک مشہور شریف وزیراعظم چوہدری محمد علی مرحوم نے برسر پارلیمنٹ اعتراف کیا کہ پہلے دفتروں میں رشوت خور لوگ عوام کی نظروں میں کھٹکتے تھے اور اب عالم یہ ہو گیا ہے کہ رشوت نہ لینے والے ملازمین بطور استثنا لوگوں کی نظر میں ہوتے ہیں۔ برائی کے اس اعتراف کے باوجود حکومت وقت مستعفی نہیں ہوئی۔

اس وقت سے اس وقت تک یہ برائی بتدریج وسعت پذیر ہی رہی، وعظ و نصیحت بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس ہوتی رہی، انتظامی اقدامات مذاق بن کر رہ گئے، اسلام کی نام لیوا اور اسے نافذ کرنے کا سہرا اپنے سر لینے والی عسکری حکومت کے سربراہ نے خود اعتراف کیا کہ جو کام پہلے پچاس روپے میں ہو جاتا تھا اب اس کے لئے پانچ سو روپے رشوت دینا پڑتی ہے، اور یہ سربراہ وہ جو ہمہ مقتدر رہتے، ان کا لفظ حکم اور ابرو کی شکن قہر تھی۔ لیکن نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔

غور کریں تو نہ یہ مسئلہ نیا ہے اور نہ کسی خاص ملک سے مخصوص ہے۔ [شاید یہ ہمیشہ سے تھا کہتے ہوئے میرا دل مجھے ٹوکتا ہے، میں اس میں سے اسلام کے تھوڑے سے ابتدائی دور کو بطور استثناء علیحدہ کرتا ہوں۔ لیکن انسانیت کی تاریخ میں یہ دور اتنا مختصر ہے کہ انسانیت

کا سر جھک جانا چاہیئے کہ اس کی عمر بھر کی کمائی بس یہ چند سال ہیں) ہمارے ہاں تو لوگ انگریز کے دور کو بھی حسرت سے یاد کرنے لگے ہیں، شومئی قسمت کہ آزاد قوم کے افراد کے دنوں کو حسرت سے یاد کرتے ہیں شاید اسی کیفیت کے ماتحت غالب نے کہا تھا،

گو سنتے ہیں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

چالیس، پچاس سال قبل کا زمانہ تو مجھے بھی یاد ہے، سننے میں آتا تھا فلاں شخص بڑا ایماند ہے، فلاں شخص کی امارت کا راز رشوت خوری ہے، فلاں افسر سے انصاف کی توقع نہیں ہو سک پی ڈبلیو ڈی کے افسروں اور ٹھیکیداروں کی ملی بھگت، امتحانات کے پرچوں میں نمبروں کی گڑ انتظامیہ کی مردم آزاری، بلاٹکٹ ریل کے سفر اس زمانے میں بھی سننے میں آتے تھے، مگر سب انگشت نمائی کے انداز میں، الزام کے طور پر مگر اب انہیں معمول سمجھا جاتا ہے، پہ رشوت الزام تھا، اب معمول، پہلے مذموم تھا اب نہیں، پہلے لوگ رشوت خور کو کالی بھیڑ سمجھتے، اب اتنی کالی بھیڑیں ہیں کہ سفید بھیڑ ڈھونڈنی پڑتی ہے،

رشوت کے بل پہ جو دوسری برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں، آپ کسی برائی کا نام لیں، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، منافع خوری، ملاوٹ، سمگلنگ، منشیات سبھی کے ڈانڈے رشوت سے جا ملیں گے، جیسے کسی زمانے میں شراب کو ام الخبائث کہا جاتا تھا، آج رشوت ام الخبائث کہلانے کی مستحق ہے۔ بنیاد اس کی زرپرستی اور اس کے بل پہ عیش کوشی اور عیش پرستی کی زندگی ہے، اثرات اس کے معاشرے میں ایک دوسر سے دوری، اپنے ہی جیسے انسانوں کے دکھ درد سے لاتعلقی، بے دلی، بے حسی، نفس پرس اور خود غرضی، زرپرست عیش پسند بے اصول بھی ہوتا ہے، موقع پرست بھی، خوشامدی منافق اور بزدل بھی، ایسے لوگ انسان نہیں رہتے بلکہ دلال بن جاتے ہیں، ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا، آپ ان سے کسی بات پر جم کر کھڑے ہونے کی توقع نہیں کر سکتے اور جو کسی بات پ جم کر کھڑا نہ ہو سکے اس سے کسی بلند تر اعلیٰ انسانی اقدار کے لئے قربانی دینے کا تو تصو بھی نہیں کیا جا سکتا [جم کر کھڑا ہونا ہی تو صبر ہے جس کی قرآن پاک میں مومنوں کو بار بار تلقین گئی ہے، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ تو روزمرہ بن چکا ہے، ایسے لوگ خدا کے ساتھ سے محروم ہ اپنی بدنصیبی پہ مہر ثبت کر لیتے ہیں، ایسے خدا محروم معاشرے میں خلفشار نہ ہو تو اور کیا ہو، اس لئے تو اپنے اس معاشرے میں اطمینان نام کی کوئی شے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی] قربانی دینے کے اسی جذبے کو تو کردار کہا جاتا ہے، جب کبھی اعلی انسانی اقدار، سچائی، عدل، حق اور مفاد خویش میں ٹکراؤ ہو تو صاحبِ کردار اصول کا دامن تھام لیتا ہے، رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا، نتائج سے بے پرواہ ہو جاتا ہے، جس قوم میں زیادہ لوگ ایسے ہونگے وہ قوم اتنی ہی باکردار، مہذب اور اقوام عالم میں سربلند ہوگی، بصورت دیگر بے چینی، بے اطمینانی، خوف اور

مایوسی اس کا مقدر رہے گی، وہی آزار جس میں ہم آج مبتلا ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ہم میں کردار کیوں نہیں رہا، کیوں ہم معمولی معمولی فائدوں کے لئے، چھوٹی چھوٹی لالچوں کے اسیر ہو کر بلند انسانی جذبوں سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

معاشرے کی خرابیوں کا جائزہ لینے سے پہلے کیوں نہ معاشرے کی موجودہ صورت حال پر انسانوں کی بنیادی ضروریات کے حوالے سے غور کر لیا جائے، شاید یہیں سے برائیوں کی وجوہ کی نشاندہی ہو سکے،

روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت، معذوری اور بڑھاپے میں سہارا اور عزتِ نفس (حصولِ انصاف؟) انسان کی سب سے بنیادی ضرورت جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے سامانِ خورد و نوش ہے، اسے ہی ہم روٹی کا مسئلہ کہہ سکتے ہیں، کھانے پینے کی بنیادی چیزوں کی آج سے چالیس پینتالیس سال پرانی قیمتوں کی ایک جھلک دیکھیں، مجھے یاد ہے بکری کا گوشت ایک روپے کا چار سیر، آٹا ایک روپے میں بیس سیر، دودھ ایک روپے میں آٹھ سے دس سیر، گھی ایک روپے میں سیر [خالص دیسی گھی]۔ یہ قیمتیں آج کے نوجوانوں کو خواب کی باتیں معلوم ہونگی مگر اس کے بے شمار گواہ موجود ہیں۔ آپ ان کو چھوڑیں، ۷۷ کی سیاسی تحریک میں نعرہ تھا ہم ۷۰ء کی قیمتیں واپس لائیں گے، ۷۰ء کی قیمتیں تو اکثر لوگ جانتے ہوں گے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ۷۷ء کے بعد کے عشرے میں قیمتیں کہاں کی کہاں پہنچ گئیں ہیں۔ یہ فرق جو قیمتوں میں آیا ہے اسے پرائیویٹ سیکٹر نے تو کسی نہ کسی صورت پورا کر لیا ہے، سبزی والے نے جب دیکھا کہ دودھ پانچ روپے سیر پہ پہنچ گیا ہے، اس نے پیاز اور ٹماٹر، گوبھی اور گاجر کی قیمتیں اسی تناسب سے بڑھا دیں، پھل والے نے پھل کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا، چائے والے نے کپ چائے کی قیمت بڑھا دی، دال والے نے دال کی، سب نے ایک دوسرے کی جیب کاٹ کر اپنا گھر پورا کر لیا، معاشرہ آدم خوروں کا ہو گیا، ہر کسی نے ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں مگر وہ جو ملازم تھے، سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھیں تو چند روپے فیصد، پرائیویٹ ملازم نے تنخواہ بڑھانے کی ضد کی تو اسے بے روزگاری کا تحفہ ملا اور کہیں کچھ ملا بھی تو برائے نام۔

دس گنا بڑھی ہوئی قیمتوں کا ۱۰، ۲۰ فیصد اضافے سے مقابلہ کیسے کیا جائے، ضروریات کم کریں تو کہاں تک، جب پیٹ پہ زد پڑتی ہے، ہر طرف محرومیاں ہی محرومیاں ہوں تو کسی نہ کسی سٹیج پہ قدم ڈول ہی جاتے ہیں اور ہاتھ دوسرے کی رگ جاں تک پہنچ ہی جاتا ہے، یہ باطل کے طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا ہے، جانتے بوجھتے ہوئے کفر اختیار کر لیا جاتا ہے، مفلسی کا کفر تک پہنچانا اسے ہی تو کہتے ہیں۔

کپڑے کا قصہ کچھ مختلف نہیں، بازار میں نکلو تو دکانیں اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑوں سے بھری نظر

آئیں گی، بڑی بڑی تقریبوں میں نئے سے نیا فیشن قیمتی سے قیمتی کپڑوں کی بہار دکھائی دیتی ہے گھروں میں الماریاں کپڑوں سے بھری پڑی ہیں جو ایک دفعہ پہنے گئے اور شاید دوبارہ ان کی باری نہ آئے [وارڈ روبوں کے نیچے اتنے ہی رنگوں کی جوتیوں کی قطاریں بھی لگی ہوتی ہیں جتنے رنگوں کے سوٹ اوپر لٹک رہے ہوتے ہیں۔

اور یہیں آپ کو بے شمار لوگ سردیوں میں کم کپڑوں میں ٹھٹھرتے نظر آئیں گے، ننگے پاؤں چلتے ہوئے لوگ بھی کوئی اچنبھا نہیں۔ ساحر نے ٹھیک ہی تو گلہ کیا تھا، ملیں اسی لئے ریشم کا ڈھیر بنتی ہیں کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں۔

اس صورت حال پہ ایک لطیفہ آپ کو سناتا چلوں، کلاس میں ماسٹر صاحب نے ایک بچے سے پوچھا، "اون کس کام آتی ہے" بچہ خاموش رہا، استاد نے حل کے لئے اشارہ بتاتے ہوئے کہا، "تمہارا کوٹ کس چیز سے بنا ہے"

ابو کے پرانے کوٹ سے! بچے نے جواب دیا۔

باہر سے آئی اترن نے بہت سے لوگوں کا بھرم رکھا ہوا تھا، اب شاید وہ بھی ممکن نہ رہے۔ رہی تعلیم، شور تو آپ اس کا بڑا سنتے ہیں، گلی گلی، محلے محلے نئے نئے سکول کھل رہے ہیں، جگہ جگہ انگلش میڈیم سکول کا بورڈ نظر آئے گا، کبھی عیسائی مشنریوں، کے کچھ انگلش میڈیم سکول ہوا کرتے تھے، ان میں آج کے سکولوں کی طرح ایک ایک بچے کی فیس ایک ایک خاندان کی کمائی کے برابر نہیں ہوتی تھی، بس واجبی سی فیس ہوتی تھی، مجھے یاد ہے، میرے بچپن کے شہر لدھیانے میں ایک مشہور مشن سکول ہوا کرتا تھا، بڑی خوبصورت عمارت تھی، بڑے اچھے ٹیچر تھے، بڑی بڑی پلے گراؤنڈز تھیں مگر بہت سے لوگ اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں داخل کروانے سے گریز کرتے تھے کہ وہاں بائیبل کی لازمی کلاس تھی، بچے عیسائی نہیں ہو جاتے مگر مسلمان بھی نہیں رہتے اور آج ہم انگلش سکولوں کے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں، مشنری سکولوں میں فیسیں پھر بھی کم ہیں، ہم ان کے لئے سفارشیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج ہمارے بچے کلمہ بھی نہ جانتے ہوں مگر ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار اور با، با بلیک شیپ ضرور گا سکتے ہیں، ننھے چہروں سے ناک غائب ہو چکی ہے، ہاں نوزی ضرور موجود ہے۔

اب فیس کے علاوہ ایک اور رسم چل نکلی ہے، داخلے کے لئے سکول کو امدادی چندہ (DONATION) جتنا بڑا سکول اتنا زیادہ ڈونیشن، پانچ ہزار، دس ہزار سے بڑھکر اونچی رئیسانہ جگہوں پہ بیس سے پچاس ہزار بھی سننے میں آ رہے ہیں۔

مکان کا ذکر کیا کروں، کبھی بہ سر چھپانے کا ٹھکانہ ہوتا تھا، اب امیرانہ ٹھاٹھ کی نمائش، ہر رئیس شاہجہان بنا ہوا ہے جو سنگ مرمر سے تاج محل بنانے پہ تلا بیٹھا ہے، عام ذرائع

کا شخص تو زمین کا ٹکڑا خریدنے کے متعلق ہی نہیں سوچ سکتا، ہاں دوبئی کا پیسہ، رشوت اور چور بازاری، سمگلنگ کا مال ہو تو اور بات ہے۔ جس نے آج سے دس بیس سال پہلے کچھ بنالیا بنالیا اب تو بلڈنگ میٹریل اور مزدوریوں کا یہ حال ہے کہ ایک اینٹ لگانے پہ ایک روپے سے زیادہ لاگت آتی ہے ——— اس وقت تک جو گزارا چل رہا ہے وہ آبائی مکانوں کی وجہ سے ہے، طلوع اسلام نے بھی بڑے بڑے مکانوں پہ پابندی عائد کرنے، محدود رقبے پر مکان بنانے کی تجویز کی ہے، اپنی جگہ یہ درست ہے لیکن اس کے اندر جو ٹیک ووڈ (ساگوان) پلمبنگ ہوگی، جو سنگ مرمر لگے گا، جو فرنشنگ ہوگی اس کو کون روکے گا، درمیانے طبقے کا بھرم جو کسی حد تک قائم ہے، کچھ گزارا چل رہا ہے تو ان آبائی مکانوں کی وجہ سے جس میں ابھی تک مل جل کر رہنے کا رواج ہے۔ ان لوگوں سے تو وہ کچی آبادیوں والے اچھے ہیں کہ زبردستی مفت کی زمین پہ کچا ڈھارا بنا کر پڑے رہے اور اب اس کے بدلے میں جائز مالک بنائے جا رہے ہیں، جو غریب شرافت کے ہاتھوں ناجائز قبضے کے گناہ سے بچتے رہے وہ زیادہ عذاب میں ہیں۔

جس معاشرے میں روٹی، کپڑے اور مکان کی یہ کیفیت ہو وہاں علاج معالجے کے متعلق آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا حال ہوگا، بجٹ میں مختص ایک فیصد سے بھی کم رقم سے غریب عوام کو کیا سہولتیں پہنچائی جا سکتی ہیں، ستر فیصد آبادی جو گاؤں میں ہے، سرکاری ڈسپنسریاں ڈاکٹروں سے خالی پڑی رہتی ہیں، کام کے حالات، بجٹ کی کمی، سہولتوں کا فقدان ——— نتیجہ یہ کہ بندگانِ خدا عطائیوں، نیم حکیموں، نیم ڈاکٹروں، جھاڑ پھونک والوں، تعویز گنڈے والوں کے کھاتے۔ چھوٹے قصبے اور شہروں میں پرائیویٹ ڈاکٹر تو ہیں مگر روٹی، کپڑے، تعلیم سے بچے تو ادھر خرچ ہو، جہاں دس دن کا علاج ضروری ہو تین چار دن کے علاج سے کام چلایا جاتا ہے کہ چلو اب طبیعت بہتر ہوگئی ہے باقی خود بخود ہو جائے گی۔ اگر کہیں لمبی بیماری سے واسطہ پڑ جائے تو سارے خاندان کے سارے شعبے متاثر ہو جاتے ہیں۔

رہے بڑے شہر تو وہاں بڑے سرکاری ہسپتال تو ہیں مگر آبادی کے لحاظ سے ناکافی، پورا دن ضائع ہو تو دوا تک نوبت پہنچتی ہے، داخلہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور ستر فیس سے بمشکل چھٹکارا ہوا ہے لیکن اب بھی سب دوائیاں پلے سے خریدنی پڑتی ہیں، اپریشن ہو تو دوائیاں کیا پٹیاں اور روئی تک مریض کے ذمے ہوتی ہے، چھوٹے سٹاف کی ناز برداریاں الگ۔

پرائیویٹ ڈاکٹر ہیں مگر پھر وہی جیب کا مسئلہ، ہاں متمول لوگوں کے لئے بڑے بڑے شاندار تازہ ترین طبی سہولتوں سے مزین ہسپتال کھل رہے ہیں جہاں کمرے کا کرایہ فائیو سٹار ہوٹلوں کے برابر ہے، باقی کے اخراجات اس پہ مستزاد ہیں ان کے متعلق تو یہی کہا جا سکتا ہے

کہ یہ ان لوگوں کی سہولت کے لئے ہے جو بیرونِ ملک جاکر علاج کرواتے تھے، کسی وجہ سے نہ جاسکیں تو یہیں گزارہ چل جائے ۔ یہ اول درجے کے شہری صرف اس وجہ سے اوّل درجے کے شہری اور وی آئی پی علاج حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس بے انداز دولت ہے، بلیک کی، سمگلنگ کی، منشیات فروشی کی، رشوت کی یا غریب لوگوں کے خون کی تجارت کی۔ اس وقت آپ کے معاشرے میں تنہا قدر روپیہ ہے، روپیہ ہی عزت و ذلت، بڑائی اور کمتری، شرافت و نجابت کا معیار ہے، جتنا جس کے پاس روپیہ ہے وہ اتنا ہی معتبر ہے، وہ معاشرے میں اتنا ہی قابلِ تعظیم ہے، علم و دانش، شعر و ادب حتیٰ کہ فن و سائنس بھی بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں۔ تکنیکی و سائنسی ماہرین بھی صاحبانِ ثروت کے سامنے خجل اور سرنگوں ہیں ــــ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!

رہا بڑھاپا اور معذوری ــــ تو بوڑھے لوگوں کا بھرم کچھ پرانی قدروں کے سہارے قائم ہے، معاشرے میں بفضلِ خدا ابھی خاندان کا تصور قائم ہے اور دادا دادی، نانا نانی ابھی عزت کے مستحق اور تعظیم کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ لاکھ تنگی ترشی ہو۔ بہرحال گزر بسر ہو ہی جاتی ہے۔ معذوری بہرحال ایک بوجھ ہوتا ہے پورے خاندان کے لئے، موت کی دعا ہی امید کی کرن ہوتی ہے۔

اسلام کا واسطہ ہر جگہ دیا جاتا ہے، اس کا نام ہر پلیٹ فارم سے لیا جاتا ہے ــــــ کیا اسلامی سوسائٹی یہی ہے ایک طرف سر بفلک عمارتیں، دوسری طرف جھونپڑیاں اور کچے گھروندے، ایک طرف فائیو سٹار بلکہ سیون سٹار ہوٹل جہاں سادہ لیموں پانی پندرہ سے بیس روپے میں دیا اور قبول کیا جائے، دوسری طرف پورے خاندان کے کھانے کے لئے اتنے پیسے میسّر نہ ہوں، نہ منبر و محراب سے اس فساد فی الارض کے خلاف آواز ہے، نہ مسندِ اقتدار سے، مگر اسلام کی دُہائی ہر طرف ہے ــــــ کیا اسلام محض ہاتھ کاٹنے، پتھر مارنے اور گردنیں اڑانے کا نام ہے ــــ

کیا یہ محض نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام ہے ــــــ یہ بلاشبہ ارکانِ دین ہیں لیکن ضرورت تھی تو یہ کہ دین کے ان ستونوں پر ربوبیت عامہ اور رحمت العالمینی کی چھت ڈالی جاتی۔ یہی فروگذاشت علّت ہے ان تمام امراض کی جن کا رونا ہر چہار سُو رو دیا جاتا ہے، اس قدر اونچ نیچ، اس قدر تفاوت، اس قدر ناانصافیوں، اسقدر بے روزگاری، خلفشار، مایوسی اور ناامیدی خوف اور حزن کے ہوتے ہوتے ہم اسلام کا نام لیتے ہیں کیسے حق بجانب ہو سکتے ہیں، ربّ کائنات نے تو مومنوں کے معاشرے کی، جنتی معاشرے کی پہچان ہی یہ بتائی ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

جہاں بنیادی ضروریات کے حصول کا یہ حال ہو وہاں رشوت جیسی لعنت سے کسی کا بچے رہنا

ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔

قانون سخت کرلیں تو قانون سے بچنے کی راہیں ساتھ ہی کھُل جاتی ہیں اور یہ بھی رشوت کے ریٹ بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں۔ درمیانے درجے کے لوگوں اور درمیانے درجے کے جرائم کو آپ شاید کسی حد تک کم کرلیں مگر اس طرح آپ اسے ختم نہیں کر سکتے، رُکے گا تو کوئی اس وقت جب اس کے دل سے یہ بات نکلے گی، جب کوئی خود حرام مال کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے جہنم کے شعلوں کی تپش محسوس کرے گا، آخر آج بھی مسلمان سؤر کے گوشت کے نام سے کیوں اس قدر بدکتے ہیں، کوئی چیز اندر سے انہیں مجبور کرتی ہے کہ اسے کسی صورت، کسی قیمت پہ بھی نہیں کھانا — مگر اپنے ہی دکھی اور مجبور بھائی کی کمائی کی طرف ناجائز ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں چوکتا،

(آپ مجھے معاف فرمائیے گا اگر میں یہ چھوٹی سی بات یہاں کہہ دوں کہ حرام گوشت نہ کھانے دقت اسے حلال گوشت یا سبزی یا دال یا کم از کم اچار روٹی یا نمک مرچ روٹی کے میسّر ہونے کا یقین ہوتا ہے)

تو کیا یہ مرض لاعلاج ہے، نسلوں کی نئے سرے سے تربیت، نئی اقدار کا نفاذ اتنا طویل عمل ہے کون اس کے انتظار کا متحمل ہوسکتا ہے ——— ؟ حالات کی تبدیلی کے لئے نفسیات میں تبدیلی تو لازمی امر ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب تک کوئی اپنے اندر، اپنی نفسیات میں تبدیلی نہیں لاتا ہم بھی اس کے حالات نہیں بدلتے، یہ تو کرنا ہی ہوگا، شارٹ کٹ کبھی دیرپا اور مؤثر نہیں ہوتا،

لیکن اس عمل کو محرومیوں کے کم کرنے کے عمل سے شروع کیا جاسکتا ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بنیادی سہولتوں کا حصول ممکن بنا دیا جائے تاکہ کوئی رشوت پہ مجبور نہ ہو، قانونی اقدامات ہوں مگر ان کا اطلاق سب پہ ایک سا ہو، اعلیٰ ترین اور بلند مناصب پہ فائز لوگ سادگی کی مثال بنیں، نمود و نمائش کی حوصلہ شکنی کی جائے، جس شادی پہ اسراف اور نمود و نمائش ہو اس میں کوئی وزیر، سفیر، گورنر، صدر شامل نہ ہو۔ ساری سرکاری دعوتیں سادگی کا مظہر اور مثال ہوں، سرکاری تقریبات پہ صاحبانِ فن، شاعروں، ادیبوں، استادوں، ڈاکٹروں، انجینئروں، دانشوروں، سائنسدانوں کو عزت و تکریم دیں — ویسے بھی معاشرے میں بلالحاظ دولت کے انہیں اہمیت دیں، ایسے لوگوں کو احتیاج سے دُور رکھیں، انہیں تخلیقی کاموں کے مواقع بہم پہنچائیں، سہولتیں دیں — آپ دیکھیں گے کہ کتنے نوجوان روپے کی دوڑ میں شامل ہوکر ضمیر کا خون کرنے کی بجائے مالی طور پر نسبتاً کم خوشحال لوگوں کی صف میں شامل ہوکر زندگی کو بامقصد طریق پہ گزارنے کو ترجیح دیں گے۔

لوگوں کو یہ بتانا کہ رزقِ حلال عین عبادت ہے، بڑا آسان ہے لیکن ان کے لئے رزقِ حلال

اور بنیادی ضروریات کی بہم رسانی کارِ فرہاد ہے جس کے لئے جگر پاش مشقتوں کی اور جرأت آزما اقدام کی ضرورت ہوگی۔

اعلان کیا جائے کہ زمین اللہ کی ہے اور جو اللہ کا ہے وہ اس کے بندوں پہ یکساں جائز ہے جیسے ہوا اور پانی کسی کی ملکیت نہیں، سورج کی روشنی اور حرارت پہ، چاند کی چاندنی پہ کسی کی اجارہ داری نہیں اسی طرح زمین پہ کسی کی ملکیت نہیں، اس سے صرف فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، رزق حاصل کیا جاسکتا ہے، خود کاشت اس کی حد ہو اور یہ یونٹ زمانے کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو تواصو اور تعاونو علی البر کی روح سے ہم آہنگ کوآپریٹو فارمنگ کی جائے۔ منافع خوروں پہ قانون ہی کی نہیں سارے معاشرے کی کڑی نظر ہو، ایسے لوگ معاشرتی زندگی سے الگ کر دیئے جائیں، کسی محفل کسی تقریب میں وہ نہ بلائے جائیں، نہ کوئی ان کی کسی بات میں شامل ہو، اس سے بھی بات نہ بنے تو ان کا معاشرتی بائیکاٹ ہو۔

زمین صرف بوائی کٹائی کا نام نہیں، زمین سے نکلنے والی ساری معدنیات، گیس، تیل وغیرہ اس میں شامل ہیں، کارخانے محض کارخانہ دار کے نہ ہوں، اس میں سبھی کام کرنے والے اس سے اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکیں ـــــ سرکاری ملازمین کی تنخواہ ضروریات کا تعین کرنے کے بعد متعین کی جائے۔

درست ہے کہ شروع میں وہ جسے آج کی دنیا میں معیارِ زندگی کہتے ہیں بظاہر گھٹ جائے گا مگر جلد ہی اجتماعی کوششوں سے ملک خوشحال، مطمئن اور مضبوط ہو جائے گا، محنت کی عظمت اور عزتِ نفس بحال ہو جائے گی، تخلیقی صلاحیتیں نشو و نما پائیں گی تو قوم، اقوام عالم میں سربلند ہوگی۔

ایسے معاشرے میں کوئی بدعنوانی کرے گا تو قانون اسے خدا کے ہاتھ کی طرح مضبوطی سے پکڑنے اور اس شر کو سختی سے کچل دینے میں حق بجانب ہوگا۔ (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب)

(بقیہ صفحہ (۵۶) سے آگے)

شریعت بل دیوبندی اور مودودی ازم ہے۔ (صاحبزادہ فضل کریم)

شریعت بل فقہ حنفی کے خلاف ایک سازش ہے۔ (منظور احمد شاہ)

بل کی بنیاد ہی جھوٹ ہے۔ (سلیم اللہ خان)

اقبالؒ اور قرآن

(پہلے یومِ اقبالؒ[1] جنوری ۱۹۳۸ء کی تقریر)

(محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ)

تمہید

باوجودیکہ قرآن کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حُسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیئے مگر متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں، رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ (۳۶/۶۹-۷۰)

اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی۔ اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان تھی۔ بلکہ یہ تو (زندگی کی فراموش کردہ حقیقتوں کی) یاد دہانی ہے اور واضح قرآن (اور اس کا مقصد یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس (کے خون میں) زندگی کی تڑپ موجود ہو (خدا کے اٹل قوانین سے) آگاہ کر دے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمامِ حجت ہو جائے۔

اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ قرآن کی رُو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حیّ و قیوم کا علمِ ازلی ہو، اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑائے، مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دے۔ یہی خصوصیت ہے جس کے لئے نوعِ انسانی کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا کرو، جب وہ تمہیں اس چیز کی

---

[1] منعقدہ لاہور

طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

"شعر" اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ "شاعروں" کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ (۲۶/۲۲۵-۲۲۶)

وہ یوں ہی اِدھر اُدھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کے قول و فعل اور قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

شاعر اور اقبالؒ میں فرق

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزلِ مقصود ہوگی، زندگی کا کوئی منتہیٰ ہوگا اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اٹھے گا اس کا رُخ خاص قبلۂ مقصود کی طرف ہوگا۔ برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوگا۔ کوئی منزلِ مقصود متعین نہ ہوگی، وہ شُترِ بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اِس حسین و جمیل وادی میں، کبھی تصورات کے اُس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیشِ نظر صرف گرمیٔ سخن ہوگا۔ اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے برعکس اس کے ایک شخص ہے جس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ ہے جسے اس قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اس کا ایمان ہے۔ وہ سوچے تو اس کی مدد سے، سمجھے تو اس کی روشنی میں، دیکھے تو اس کے نور سے، وہ حقائق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر اور قبول کرے تو اسی کو جو اس کی رُو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو اور رد کرے تو اس کو جو اس کے نزدیک مردود ہو، اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو (جو دراصل قرآن پاک ہی کے حقائق ہوں گے) زبانِ شعر سے ادا کرے تو مومنین کے اس زمرہ میں آجائے گا جس کا ذکر قرآنِ کریم نے اس آیت میں کیا ہے جو مذکورۂ صدر آیت سے متصل ہے:۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ...... (۲۶/۲۲۷)

مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی گئی ہو۔

اقبالؒ اسی زمرہ میں شامل ہے اور علومِ حاضرہ کے متعلق فکر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا، ان کی رُو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا

مفکّر پیدا نہیں کیا۔

لہٰذا، اگر یہ درست ہے کہ کسی مفکّر کے پیام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہہ تک پہنچا جائے جس پر اس کی فکر کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کی جائے جو اس کے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلاتکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک قرآنِ کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو جو اس زاویۂ نگاہ سے پیغامِ اقبالؒ کو دیکھے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضرتِ علامہ قرآنِ کریم کے ان حقائق اور ارق مسائل کو کس خوبصورتی سے ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایامِ "جاہلیت" میں اقبالؒ کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا۔ اور ان کے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لطف اٹھایا تھا۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبالؒ کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد ان کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ کیا کہتا ہے، کیوں کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کون سی شاعری ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہِ گم کردہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ (۲۶/۲۲۴) اور وہ کون سی ہے جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسے شاعر کے متعلق حضرتِ علامہ فرماتے ہیں۔ ؎

سرچشمۂ فکرِ اقبالؒ

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل — ملّتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است — شاعری بے سوز و مستی ماتمے است
شعر را مقصود اگر آدم گری است — شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

بہر کیف یہ ہے وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے قرآنِ کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے ان حصّوں سے معلوم ہو گئی ہو گی جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں[1] قرآن فہمی کے اسی اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گراں مایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردنِ تشکّر ہمیشہ نگوں سار رہے گی۔ ان میں حضرتِ علامہ کی ذاتِ گرامی ایک ممتاز حیثیت

---

[1] معارف القرآن کی حسبِ ذیل مجلّدات اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برق طور۔ شعلہ مستور معراج انسانیت۔ جہانِ فردا۔ من و یزداں۔ کتاب التقدیر وغیرہ

رکھتی ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں قرآنِ کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رُک گیا تو علامہ کے ایک شعر نے ذہن میں بجلی کی سی ایسی چمک پیدا کر دی جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق الجھاؤ پیدا ہوا تو کسی آیتِ قرآنی نے اپنے "سمسم" کے اعجاز سے قفلِ ابہام کو کھول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اس دور میں جب کہ مسلمان قرآنِ کریم سے بہت دُور جا چکے تھے، ان کے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے بربطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمۂ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں جیسے دامنِ کوہسار کی چاندنی رات میں دُور سے بنسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑ سی ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھُلے ہوئے الحاد اور دہریت کی وجہ سے انکی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ حضرت علامہ نے دین کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی روح پھر سے ان کے خون کے ذروں میں جذب ہو گئی۔ اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآنِ کریم کے قریب لاکر کھڑے کر دیئے گئے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیمیافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبالؒ سے اسے کچھ ذوق ہو اس کے سامنے اگر قرآنِ کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہچانی ہوئی حقیقت محسوس کرنے لگتا ہے۔

جب حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا پورا پیام قرآنِ حکیم ہی کی تعلیم کی تفسیر ہے تو پیامِ اقبالؒ پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تمام و کمال تبصرہ ناممکن ہے جب تک پورے کا پورا قرآن سامنے نہ لایا جائے۔ اس مقصدِ جلیلہ کے لئے میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت قرآن کی اساسی تعلیم کے ایک آدھ گوشہ پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی جا سکے گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبالؒ کا پیام کس طرح قرآنی حقائق کو اپنے جاذب و دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے پیامِ اقبال کا تجزیہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میرے پیشِ نظر ہے اور اگر توفیقِ ایزدی نے میری یاوری کی تو معارف القرآن کی تکمیل کے بعد اس طرف بھی توجہ دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی قرآن فہمی کے لئے جس قدر حضرت علامہ کی بصیرت کا رہینِ منت ہوں۔ اس کے سپاس گذاری کے تقاضے سے میں اپنے اوپر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اقبالؒ کے پورے پیغام کو قرآن کی روشنی میں پیش کروں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ہمت اور فرصت عطا فرمائے۔

اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت

لَا اِلٰہَ۔ اِلَّا اللّٰہُ

اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم جو پیغام نوعِ انسانی کو دیتا ہے وہ ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی (NEGATIVE) یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے، جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ جس کے قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اُسے مٹا دینا ہوگا، ہٹا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو (AFFIRMATIVE SIDE) آئے گا۔ تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کے قانون کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم، دنیا میں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے۔ ان کی حیاتِ مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنمکدہ میں بتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی[1]۔ پہلا قدم لَا اِلٰہ تھا اور اس کے بعد اِلَّا اللہ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو، نیا مکین آ کر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

اسی لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں یوں آتی ہے۔

فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کر کے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے، اس نے ایک ایسے مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ شانِ خلیل ایں طلسم در شکنیم	کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے کا نام ہے اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا جو طاقت بھی ہو، اس

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے۔ جوئے نور۔

کے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ قوتیں وہ بُت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگتراش کے ہاں نہیں ہوتی۔ یہ خود ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں ہوتا خود قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بت، عزت وجاہ کا بت، دولت وثروت کا بت حکومت و سلطنت کا بت۔ ملک ونسب کا بت۔ اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اس کے حجلۂ دماغ میں ترشتے رہتے ہیں۔ جن کے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے، گڑگڑاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ماتھے رگڑتا ہے۔ یہ ہیں وہ بُت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ بُت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں گر جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ (۴۵/۲۳)

(کیا تو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا؟ یہ ہے وہ جسے خدا کے قانونِ ہدایت نے باوجود علم وعقل کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں، جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم وعقل بھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بُت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
دست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ اُسے دوسری میں الجھا دیتا ہے۔ ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو یہ دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے حالانکہ جس رسولِ اکرمؐ کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے، ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)

وہ انسانوں کے طوق وسلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ان کے بوجھ ہلکے کرنے اور ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کے لئے

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

فکرِ انساں بُت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام اورنگ است وہم ملک ونسب

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن تیغ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوْ بزن

جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے، خدا کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آ سکتا۔ جب تک لوحِ قلب صاف نہ ہو توحید کے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے۔ فرماتے ہیں ۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیئے

یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے۔ جب تک

نفی اور اثبات

آپ دوسرے آقاؤں سے رُخ نہیں موڑ لیتے، نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے۔ جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا، جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا تلوار پہ نئی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے ۔ ؎

آتشے افروز از خاشاکِ خویش شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

اسی کو ہر جگہ ریختہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آ جائے تو اندھیرا گھر چھوڑ جائے

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱)

کہیے کہ حق آیا اور باطل غائب ہوا۔ باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہو جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغِ حق کے لئے کرنا کیا چاہیئے۔ فرمایا ۔ ؎

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حُسنِ شعریت" ملحوظ ہوتا ہے، وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "وزنِ بیت" نہ ہو بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی قرآنِ کریم کے مختلف حقائق کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہو تاکہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آ جائے لیکن عدمِ گنجائش مانع ہے۔ مثال کے طور پر مذکورۂ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کیلئے

"مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے۔ نبی اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے، بحث و جدل کا تقاضا کرتے۔ لیکن قرآن کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک

معیارِ صداقت

اور ہی معیار پیش کر دیا اور چیلنج دے دیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اترو۔ فرمایا۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۹۴)

(اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان)

دیکھئے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاکی میں جان" پیدا کرنے کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآن کریم کی روشنی میں پورے نظریہ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) کو بیان کرنا ہوگا اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں[1]۔

ہاں تو کہا یہ جا رہا تھا کہ جب لَا کی تخریب کے بعد اِلَّا کی تعمیر کی جائے، تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ جو یکسر اضطراب اور عدم اطمینان کا دور ہے، اپنی ہر روش پر لَا ہی لَا کا مسلک اختیار کئے جا رہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے حالانکہ یہ محض استہلاک (DESTRUCTION) ہے تعمیر (CONSTRUCTION) نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سوسائٹی کی مسلمہ روایات سب اسی سیلابِ لَا کی نذر ہو چکے ہیں اور اس کے بعد اِلَّا کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوئی۔ حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے فرماتے ہیں:

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ

نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا
پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ

عصرِ حاضر کے متعلق ارشاد ہے۔

لبالب شیشہ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلَّا

روس اس لَا کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے

اشتراکیت کا بحرانِ نفی

شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) عائلی زندگی کی نفی۔ تدبیر منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی بھی ضروری لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑیئے تو حقائق پر ایمان لایئے۔ اس تفریط (EXTREMISM) اس یکسر کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم"

دنیا بھر میں انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں کہ باریک بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ روس[1] کے متعلق ارشاد ہے :-

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تند بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ امتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے :-

نکتہ می گویم از مردانِ حال — امتاں را لا جلال اِلّا جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات — لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئے جب تک قومیں لا کے بحران میں رہتی ہیں، عدمِ سکون و فقدانِ طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں کسی محکم چٹان پہ ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے۔ دنیا میں شور مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے۔ جسے چشمۂ حیوان تصوّر کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں۔ كُلَّمَآ اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (۲/۲۰) جب ذرا بجلی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور یہ نتیجہ ہے اِلّا کے نہ ہونے کا۔ اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے :

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین

---

[1] روس تو اب قریب قریب پھر نظامِ سرمایہ داری تک پہنچ رہا ہے۔

کی پستیوں پر آگرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کو کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اچک کر لے جائے۔ یا جیسے تندوتیز ہوا کے جھونکے (پرکاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔

گویا اس نظام کا مرکزِ ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لآ ہی لآ ہو، اِلآ نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے، سکون نہیں ہوتا۔ اسے کہیں جم کر کھڑے ہونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی   مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعمیر کا سبق وہ ملتِ اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام   ہرکہ در ورطۂ لآ ماند بہ اِلآ نرسید

اور ان مسلمانوں کو جو ہزار ہزار دانے کی تسبیح پڑھنے کے باوجود لآ الٰہ اِلآ اللہ کے معنی نہیں سمجھتے پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ

کافرا دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند   برخویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز نادیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لآ کہاں تک جائے گا اور اِلآ کہاں سے شروع ہو گا۔ جب تک انسان لآ کے بھنور میں رہتا ہے۔ وہم و قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلبِ انسانی کس جہنم میں رہتا ہے۔

خدا کا دستِ قدرت

اطمینان و سکون یقین میں ہے اور یقین پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس سلبی لآ کے بعد ایجابی اِلآ نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے، اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعہ بدر دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔ لیکن جن کی نگاہیں دوررس اور دقیقہ شناس واقع ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدا نکردہ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سربکف میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہو جاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل شعور و ادراک، حکمت و فلسفہ کیا شے ہے اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آج نہ اقبالؒ ہوتا نہ اقبالؒ کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کرنے والے حقائق اور روح میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں جب کہ

تین سو بارہ بظاہر بے کس و بے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷)

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کی بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے۔ (تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوند رہی تھیں، تیر تمہارے تھے اور ان کی اینوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں۔)

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوب گماں رہتا ہے۔ جو ایمان محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں الجھا رہتا ہے۔ اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں، تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں، تمام ساز و سامان تمام جیوش و عساکر، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح کا پتلے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ۔ (۵/۵)

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اسکے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جائے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہو جاتی ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روحُ الامیں پیدا

قرآن کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) مت ڈرو، بالکل نہ گھبراؤ تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے

جب انسان میں اس ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اسکی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے وہ ہر ایک شے کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

میانِ آب وگِل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم جہاں را جز بچشم خود ندیدم

قرآن کریم نے علم کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ سمعؔ، بصرؔ اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔
لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ - اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمعؔ، بصرؔ اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہوگی۔

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطور علم کے تسلیم کیا تھا اُسے تم نے سماعت وبصارت کی رُو سے

علم وعقل

تجربات ومشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلبِ سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآنِ کریم نے جہنمی قرار دیا ہے۔
لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا - اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (۷/۱۷۹)

وہ لوگ جو دل ودماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے تو یہ بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔

بیکنؔ نے علم کے متعلق یہی نظریۂ استقراء پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآنِ کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی لیکن قرونِ اولیٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اُڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب وتعظیم سے رکھ چھوڑا۔ اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گریں تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔
حضرت علّامہ علم کی اس قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں را جز بچشم خود ندیدم"
اسی "چشمِ خود" کے متعلق ضربِ کلیم میں ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار وتخیل کی گدائی کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیّر انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ میں يَوْمَ

تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

بخود نگر ، گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی
اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے ۔

تبدیلیٔ نگاہ

ایک منزل را نمی دانی ز رہ
قیمتِ ہر شئے ز اندازِ نگہ

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسمان دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں جنہیں وہ بزعم خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبالؒ کو بھی لہو رلاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

لیکن مومن کی یہ "چشمِ خویش" یہ اپنی آنکھ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآن کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے کہ جس طرح آنکھ بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے دیدۂ عقل قرآن کریم کے نورِ مُبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اس کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور قرآن کریم ہے۔ ایک مردِ مومن دنیا

قرآن کی روشنی

کی ہر شئے کو قرآن کی روشنی میں دیکھتا ہے اس کے افکار و آراء اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔

یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہیں تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآن کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ اور چونکہ وہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے۔ اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اور انسان پھر کہیں لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصّہ اِلاّ جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اور جس سے محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے۔ اور یہ حصّہ الاّ یہ خدا کے غیر متبدل قوانین یہ فطرت کے اٹل حقائق سوائے قرآنِ کریم کے دنیا میں آج کہیں نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت علاّمہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآنِ کریم انسانوں کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے۔ یہ نگاہوں کو

کس اوج تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ قلبِ انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کسطرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں وہ قرآن کریم کا ذکر کرتے ہیں، وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے قرآن کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے۔ وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔ رموز میں فرماتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اولا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — آیۂ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو را رحمۃ للعالمین!

اور سنیئے۔

فاش گویم آنچہ در دلِ مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست — ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست" اس "عصرہا پیچیدہ" کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے جہاں اندر جہاں "زمانہ در زمانہ" ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا۔

قرآن اور رموزِ کائنات

قرآن کتابِ فطرت ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی جا کر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آ چکا۔ اب میں خالی برتن ہوں۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ آدم کے وقت لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات زمانہ کی عقل و علم تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے بیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے اسی پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں کیا آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے، یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے۔ دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتی چلی جائے فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی۔ اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج

اس میں اثیر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ کیا اثیر پہلے موجود نہ تھا کیوں نہ تھا۔ اسی فضا میں لپٹا ہوا تھا پیچیدہ تھا۔ یہی قرآنِ کریم کی کیفیت ہے۔ زمانۂ عقل و علم کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہوں گی خود بخود سمجھ جائیں گی اسی طرح قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی اس وقت اس کی کوئی آیت متشابہ نہیں رہے گی سب محکم ہو جائیں گی یہ میں نہیں کہتا خود قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے۔

انسانوں کی صحیح پوزیشن

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے، اسے سب سے پہلے قرآنِ کریم ہی نے متعین کیا۔ یہ اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (۴۵/۱۳)

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے، اس نے ان سب کو تمہارے لئے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) قرآنِ کریم کوئی علم الحیات (BIOLOGY) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ ہاں ہم جہاں کہیں ضمناً تخلیقِ انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں قرآن اس کے خلاف ہو۔ بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ محض قیاس آرائی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا یہی نا کہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کد و کاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی۔ اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ اثیر اس

سائنس اور قرآن

فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں۔ لیکن پہلے وہ نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں لیکن خدا وہ

ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کریگا وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآن کریم کا بیان باہم متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو، سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے، قیاس آرائی ہے۔ جب حقیقت، حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہوگی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اسی نظریۂ ارتقا کو لیجئے جسے دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکتہ الآراء کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثلاً فارابی اور ابن مسکویہ نے ڈیلیس اور ڈارون سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔ (نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم ایک جداگانہ مبحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔) لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس حصہ

انسان اور سلسلہ ارتقاء

زندگی کو محض ابتداء قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقا کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتداء ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلۂ ارتقاء میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے۔ اس میں تعقل و ادراک نہیں لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ جو چیز پہلی کڑی میں مفقود تھی، اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل یعنی انسان میں یہ خصوصیت ابھر کر سطح پر آجاتی ہے یعنی اس میں شعور و ادراک جذبات و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی گویا سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی میں مادیت سے کسی غیر مادیت کی طرف قدم اٹھتا ہے وہ "خاکی" سے کچھ "نوری" سا ہو جاتا ہے۔ ہر چند یہ "غیر مادی" عنصر (اسے ایسا ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا) انسان میں آکر نمایاں ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں

جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور مسلم حکیم میں فرق شروع ہو جاتا ہے۔ حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے، اور موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ شبِ تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ عقل و خرد، یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سلسلۂ ارتقاء جتنا آگے بڑھتا جائے گا، تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمالِ صالح ہوں گے یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی، اس سے نفیس و لطیف، اس سے اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کر سکے۔ وہ اپنے اوپر کی منزل میں چلے جائیں گے جسے جنت کہتے ہیں جن کے اعمال انہیں اصلح نہیں بنائیں گے وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہیں روک دیئے جائیں گے۔ یہ جہنم کی زندگی ہوگی، لہٰذا موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے، ذرا اسے سنورنے دیجئے، پھر دیکھئے یہ کیا بنتا ہے۔ "انسان کا مستقبل" یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ ماسکہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تابش او پُرخوں شود روزے

اس نظامِ کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اس کے لئے اس داستانِ حقیقت کُشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدمؑ کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیلی داستان میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے خود "آدمی" مراد ہے۔ یعنی وہ داستانِ خود آدمی کی داستان ہے جسے اس قصہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ آدم گویا نوعِ انسان کا نمائندہ ہے۔ فرشتوں سے کہا جاتا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، یعنی ایک ایسی صاحبِ اقتدار مخلوق جو زمین پر سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٰ آب و گل کو دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ بارِ الٰہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلّاقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسم نے گلفشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: میں جانتا ہوں کہ یہ مضمون مکمل ہو کر کیا بننے والا ہے اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی اسے علم الاشیاء یعنی علم الفطرت، عطا کیا گیا، اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ

قصۂ آدم

جانتے ہو۔ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا نہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین یہ عظمتوں کا پتلا، اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اب سوائے اعتراف حقیقت کے چارہ کیا تھا۔ وہ جھکے اور بار بار جھکے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ ؎

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند   کجا خاکے کہ در آغوشش دارد آسمانے را

بالِ جبریل میں ہے۔ ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے   جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر۔ فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجا لائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے۔ پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے گا۔ اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ یہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے، یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالاتر مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور یہی چیز اُسے نظامِ کائنات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اجتباء یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کے لئے ایک یقینِ کامل اور عملِ پیہم کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ "خیرِ امت" بن جاتی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خیرامت کا مقام کس درجہ بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔ ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو   قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو   دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ   تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸)

مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ، تم دنیا میں سب سے بلند ہو۔ بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے   یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی   ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا ابد تیرا   خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تیری فطرت اَمیں ہے ممکناتِ زندگانی کی جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگران رہو اور تمہارے (اعمال کے) نگران رسولؐ ہوں

مقامِ مومن

مسلم کی تو شان یہ ہے کہ یہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون راستے سے بھٹک گیا ہے، اسے تمام اقوامِ عالم کا نگرانِ کار (SUPERVISOR) بنا کر بھیجا گیا ہے اور مرکزِ ملت اس کے اعمال کا نگراں۔ جب مومن کے علوِ مرتبت کی یہ شان ہو تو پھر دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے، یہ تو اس کی وراثت ہے کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔ ؎

عالم سے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس فقط کو دیکھئے کسی اور کا اس میں حصہ نہیں یہ بطورِ حق کے اس پہ قابض ہوگا کہ کوئی اور اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور کس قدر سچا فیصلہ!

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ (۲۱/۱۰۵)

اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ بے شک زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔ ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور یہ اس لئے کہ مومن کی برابری دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو اعلیٰ ہے سب سے بلند و بالاتر ؎

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتے اُو برنتابد ہمسرے

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی نوعِ حیاتِ انسانی کا اولیں گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے ابھی جوان ہونا ہے۔

تسلسلِ حیات

اس لئے قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی بایں ہمہ رعنائی و زیبائی، اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ[1]۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹/۶۴)

---

[1] دنیا اور آخرت کی قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے "اسبابِ زوالِ امت" دیکھئے۔

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شئے کا نام ہے۔ جہاں کوئی شئے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔ ؎

زندگانی از خرامِ پیہم است		برگ و سازِ ہستیٔ موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو ولعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔ ؎

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما		فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است		جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاکِ در میخانہ" اور گردشِ یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لائیے آیت مذکورہ کے اس حصہ کو کہ "وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ" اور اس دیباچۂ افسانۂ ما کے ساتھ کہ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب ابھی شروع ہونے والی۔

ہر چند بات لمبی ہو رہی ہے لیکن جی نہیں چاہتا ہے کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یوں ہی چھوڑ کر آگے گزر جائیں "حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است" کے لئے مجھے نظریۂ ارتقاء بیان کرنا چاہیئے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ضمناً بیان کرنا دشوار ہے یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرعہ کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآن کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (PLAN) کرتا ہے پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کرانا ہے قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات میں سے گزرنا ہوتا ایک ایک مقام اور ایک ایک

سلسلۂ ارتقاء

منزل کا نام یوم ہے لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ (۳۲/۵)

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر پختگی اختیار کرکے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں اسی کرۂ ارض کو دیکھئے یہ اپنے اولین ہیولیٰ سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پہ کوئی ذی روح آباد ہو سکے اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود

تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے اور کس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں ‏ ‏ کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ہاں تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا۔ ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے۔ اس کتابِ مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعویٰ ہے کہ آؤ تمام نوعِ انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل پیش کر کے دکھاؤ۔ ایسے شجرِ طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں ؎

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ‏ ‏ ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

پیامِ مشرق کے دو شعر ہیں ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ‏ ‏ ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود
شعلہ بودیم و شکستیم و شررہ گردیدیم ‏ ‏ صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمائیے شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک حرارت پیدا ہو جائے انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائق و اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہوگی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شررہ بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ ولا غربیہ آیا ہے جو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں یعنی ادھر سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور ادھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ دیدہ و دل فرشِ راہ! یہ نورانیاں وادیاں یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ۔ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (۱۶/۳۲)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو، آئیے جنّت میں داخل ہو جائیے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھیے اور پھر اس شعر کو پڑھیے کہ ؎

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گر دیدیم صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گر دیدیم

پھر جنّت کے متعلق جو اس آیت میں اور دیگر متعدد آیات میں آیا ہے کہ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ یعنی جنّت اعمال کی جزا ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا ایک شعر سنیئے اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ تخلیقِ آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں۔ آدم کے جنّت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی رعائت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارہ کہنا کس قدر موزوں ہے۔ آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا ہے وہ یہ تھا کہ اے بارِ الٰہ! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی۔ اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس ہبوط کے بعد ان تمام ارتقائی منزل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارا مہِ کامل بن جائے اس کی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (والتین)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔ پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے درجہ میں لوٹا دیا مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کئے۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

انسان میں ایمان و عملِ صالح پیدا ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حدود و آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ ارتقاء اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں یورپ کا مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ لیکن قرآنِ کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان میں جھولے جھول رہی ہوں۔ اسی لئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ :-

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحان" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوٰت کہا جاتا ہے، آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے

ستاروں کی دُنیا

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲/۲۹)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ اور ہم نے تمہارے اوپر متعدد رہگذر بنائے۔ یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں، نجوم کون کونسی ارتقائی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں اور عشق کی کون کونسی وادیوں میں سرگرداں ہیں پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں، قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا کیسا حسین انداز ہے۔

شعر کو جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی

اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات　　ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یا اس انداز کا کہ ؎

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ　　ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے　　کیوں برا کہنے سے تو اس کے برا مانتا ہے

اور ایک ذوقؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے اچھے شعر کہنے والے جب بزبانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے لیکن یہ خصوصیت حضرت علّامہ ہی کے حصّہ میں آئی ہے کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں اور شعر کے حُسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں ؎

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست　　کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

زندگی مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا، بڑھتے جانا، بڑھتے ہی چلے جانا کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں یونہی ذرا ستانے، دم لینے کے لئے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنّت کہ جسے بالعموم منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے، راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنّت میں پہنچ کر بھی اہلِ جنّت کی یہ کیفیت ہوگی کہ

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲)

ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف چلتا ہوگا۔

یہ نورِ پیشانی کی روشنی یہ سرچ لائٹ اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لئے ہوگی۔ وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے کہ جنّت میں پہنچ کر بھی وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ۔ ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی (۲۲/۲۴) اس لئے جنّت بھی مقام نہیں راہگذر ہے وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے ؎

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند　　کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

لیکن بایں ہمہ انسان (لامکاں) نہیں ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کون سی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد

اگلی منزل کون سی ہے سو اس کی تفصیلی شرح و بسط سے قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اس منتہیٰ کے متعلق تو سردست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا۔ اس کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے۔ ؎

شعلہ در گیرزد بر خس و خاشاکِ من   مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علامہ "واصل بالحق" ہونے کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں اور اسے انسان کی خودی کے محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں بلکہ تہہ دریا گہر بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ ؎

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی   ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحرِ نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے وہ کون سا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا لیکن "او را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے موجودہ مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی کہ "ربِّ ارنی" تو جواب ملا "لن ترانی" (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہوگی کہ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ ؎

عبد و مولا در کمینِ یک دگر   ہر دو بے تاب اندازِ ذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است   حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ اپنے رب کی طرف رواں دواں ہو جائیں گے تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا اور تیرا رب اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے کہ

ہر دو بے تاب اندازِ ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے۔ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہوگی یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے، کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے۔

یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریفِ سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن ان سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے اور یہی نکتہ در اصل کلامِ اقبالؒ کا محور ہے، مرکز ہے، محیط ہے۔ سب کچھ ہے، یہ نکتہ یہ ہے کہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کے خودی کے استحکام کا۔ کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جس کی شان میں آیا ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ تو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے جو دانائے سبل "ختمِ رسل" ہے۔ جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ کامل ہے۔ جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرش آشیاں ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تمام فضائیں اور

اطاعتِ مرکزِ قرآن

فضاؤں کی پہنائیاں یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں یہ ارض و سمٰوات یہ تمام کائنات اور اس کی قیود ناآشنا وسعتیں اس شاہینِ شہِ لولاکؐ کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعتِ عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسّر آتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ اے رسولؐ تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں پھر تمہارے فیصلوں پہ دل میں کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں (۴/۶۵)

اس نکتہ کے اندر امّت کی مرکزیت امیر کی اطاعت وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکّن فی الارض شان و شوکت حکومت و سطوت زمین پر آسمانی بادشاہت) کا قیام سرفرازیاں اور سربلندیاں کامیابیاں اور کامرانیاں اور اس کے بعد جہاتِ اُخروی میں بعد کی منزل میں آگے بڑھنے کی قوتیں مدارجِ عالیہ یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھیڑ دینا پڑا ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پہ کلامِ اقبالؒ سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اقبالؒ کی تمام شاعری اور شاعری کا تمام سوز و گداز رہینِ منت ہے۔ محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جذبۂ اطاعت کا اسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز محبت ہے جس نے اقبالؒ کو اقبالؒ بنا دیا ورنہ یہ بھی کہیں میرِ مشاعرہ ہوا کرتے

جذبہ اطاعتِ رسول[1] نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبالؒ کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا۔ محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمیٰ سے وہ قلبِ منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ "درونِ او نہ گل باشد نہ خار است" اسی نگہ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؒ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ، ایمان و حکمت کا فشردہ، زیرکی و عشق کا عصارہ، اویس و بوعلی کا مرکب مجسمہ، رومی و رازی کا مشترکہ شاہکار، مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔ ؎

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآنِ کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا۔

إِنَّ فِي ..... لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (۳/۱۹۰–۱۹۱)

بے شک (ان مظاہر فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کے لئے آیات ہیں یعنی وہ لوگ جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

یہ عقل و بصیرت کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومنین ہیں جنہیں نوعِ انسان کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔

اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کے اس نگۂ حقیقت بین کو اظہار جذبات کیلئے

---

[1] نظامِ اسلامی کی رُو سے کسطرح امامِ متفقہ علیہ (مرکزِ ملت) کی اطاعت اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے مرادف ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں بہ صراحت اسکی تشریح موجود ہے اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے۔ اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے۔ ان امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے۔ "اسلامی نظام"

ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہل و بولہب کی سی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشہ یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اور اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیق عنیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بلبل مذکر ہے یا مؤنث سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدہوں کو نگل جائے یہ اور بات ہے کہ قوم اقبالؒ کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قوم موسیٰؑ کی طرح کہہ دے۔ فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ جا تو اور تیرا رب لڑ د جا کر۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں جب فتح ہو جائے تو آواز دے دینا باہیں ہمہ، یقین مانیئے کہ جس طرح قرآنِ کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کر کے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ اقبالؒ نے بھی مشکوٰۃِ قرآن کی روشنی میں "عجمی شاعری" کے "دورِ جاہلیت" کو ختم کر کے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمین از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

دورِ حاضر کے پیدا کردہ خلفشار میں **وہ کونسا دماغ ہے** جس میں اس قسم کے سوالات نہیں ابھرتے کہ۔

- کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے؟ کیا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عمر دھکے کھاتے رہیں؟ کیا خدا کو ایسا ہی منظور ہے؟
- کیا موت کا ایک دن مقرر ہے، یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے؟ • بعض بچے پیدائشی اندھے، لولے لنگڑے کیوں ہوتے ہیں۔ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟ • اگر خدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا؟ • کیا دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ اگر نہیں بدلتی تو ہم دعا کیوں کرتے ہیں۔ یہ اور

اس قسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلہ تقدیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے، یہی وہ مسئلہ تھا جسے صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا کہ مذہب **عوام کیلئے افیون** ہے مفکرِ قرآن **علامہ پرویزؒ** نے دنیا کے اس مشکل ترین مسئلہ کو اپنی تازہ تصنیف

کتاب التقدیر

میں، قرآنِ کریم کی روشنی میں اس عمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے جلد مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نگاہ۔

قیمت ساٹھ روپے (علاوہ محصول ڈاک) — **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام** (رجسٹرڈ)

حقائق و عبر

۱۔ دستور کمیٹی اور مولانا مودودی

ان دنوں جماعت اسلامی والے، مودودی صاحب کو پاکستان کے بانیوں میں شمار کرانے کیلئے تاریخی حقائق کو جس طرح توڑ موڑ رہے ہیں، اس کے جواب میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں مندرجہ ذیل مراسلہ شائع ہوا ہے:۔

مکرمی نوائے وقت (۷ اکتوبر ۱۹۸۶ء) میں جماعت اسلامی ضلع فیصل آباد کے امیر رانا محمد انور طاہر کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے بڑے فخر سے کہا ہے کہ "پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کا دستور تیار کرنے کے لئے قائداعظمؒ نے جو دستوری کمیٹی ترتیب دی تھی تاکہ بننے والے پاکستان کے لئے دستور تیار کرے جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی اس میں نافذ کر دیا جائے۔ اس دستوری کمیٹی میں برصغیر کے جید علماء میں سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی بھی موجود تھے"۔ رانا صاحب نے متعین طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ کمیٹی کب متشکل کی گئی تھی۔ موضوع کے اعتبار سے یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی طرح سے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا "اسلام کا سیاسی نظام" اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں (یا اس سے قبل) مسلم لیگ نے یہ طے کیا تھا کہ اسلام نافذ کیا جائے گا۔ اور اس اسلامی نظام کا دستور مرتب کرنے کے لئے اس نے ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی تھی جس کے ایک ممبر مودودی صاحب بھی تھے جس کا اقرار رانا محمد انور صاحب کو بھی ہے اس کے بعد مودودی صاحب اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں کہ "مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے"۔ یعنی ۱۹۴۰ء یا اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے مودودی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے مقرر کردہ اس کمیٹی کے ممبر منتخب کئے گئے تھے۔ جس کے ذمے یہ فریضہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے لئے اسلامی نظام کا دستور مرتب کریں اور مودودی صاحب ۱۹۴۱ء میں یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ مسلم لیگ کی طرف سے آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس کا مطمع نظر پاکستان میں اسلامی

نظام قائم کرنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس کا مطمع نگاہ یہ نہیں تھا تو وہ کمیٹی کس واسطے مقرر کی گئی تھی؟ اس قدر کھلی ہوئی تضاد بیانی کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں اور ملے۔

۲۔ افغان مجاہدین

جماعتِ اسلام کا ترجمان ہفت روزہ ایشیاء اپنی پانچ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں ایک افسوسناک انکشاف کے تحت لکھتا ہے:۔

امریکہ کے ایک سینیٹر اورن ہیچ نے عہدِ قریب میں افغانستان کا دو مرتبہ مطالعاتی دورہ کیا۔ پھر سینٹ کمیٹی کے سامنے اس کی رپورٹ کی۔ اس کا کہنا تھا کہ

مجاہدین کو اتنا روس سے نقصان نہیں پہنچ رہا جتنا باہمی نا اتفاقی سے پہنچا ہے۔

اس نا اتفاقی کے نتیجے میں ایک تو مجاہدین روسی اور افغان دستوں پر کاری ضرب نہیں لگا سکے۔ پچھلے سال کے جنگی نتائج اور موجودہ سال کے جنگی نتائج میں نمایاں فرق ہے۔ پچھلے سال مجاہدین کے روسیوں پر حملے زیادہ شدید تھے لیکن اس سال اتنے زوردار نہیں ہیں۔

اس نا اتفاقی کے نتیجے میں جو اور افسوسناک خبریں آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ بعض مجاہدین نے جہاد چھوڑ دیا ہے۔ کابل حکومت کے ایک دعوے کے مطابق ۳۰ ہزار مجاہدین نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہ خبریں صحیح ہیں یا غلط لیکن ظاہر ہے کہ جب نا اتفاقی کی فضا موجود ہو تو دشمن کو ایسے دعوے کرنے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ اور وہ ایسا دعویٰ کرے تو اس کی تردید کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

۳۔ اہلحدیث اور جماعتِ اسلامی

جماعتِ اسلامی نے مجوزہ شریعت بل کے سلسلے میں جس طرح اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے، اس کے بارے میں جماعتِ اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاسلام نے اپنی ۳۱ اکتوبر کی اشاعت میں مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:۔

اس ملک میں دنیا بھر کے عجوبے افراد کی صورت ملتے ہیں، جتنا بڑا کوئی "عجیب القول" ہوگا۔ اتنا ہی "مرغوب" ہوگا۔ جتنا کوئی "عجیب الخلقت" ہوگا اتنا ہی محبوب ہوگا، جتنا "عجیب الحرکات" ہوگا اتنا ہی "مجذوب" ہوگا۔

یہاں راہنمائی کے لئے دانشِ نورانی اور فکرِ برہانی کی ضرورت نہیں یہاں "بونگے" چلتے ہیں۔ دلائل و شواہد پیش کرنے والے "بے ایمان اور کافر" قرار دیئے جاتے ہیں اور ملک و ملت کے مفاد میں کام کرانے

والے "غدار اور ملک دشمن" شمار ہوتے ہیں۔ صحیح اسلام کی بات کرنے والے "پیدائشی مسلمان" اور "حق گو" فرقہ پرست کہلاتے ہیں۔

یہاں "معیارِ انسانیت" پارٹی کی ممبری اور "مقامِ آدمیت" "جماعتی" رکنیت ہے۔ یہاں جو ہمارا وہ ستارہ! "جو غیر اس سے بیر" کی سیاست چلتی ہے، حق وہی سمجھا جاتا ہے جو جماعتی امیر کہے ورنہ حق بھی ناحق ہے، جو جماعتی راہنما نے کہہ دیا وہی ٹھیک، باقی غلط ....

اور تو اور شریعت بھی وہی شریعت ہے جو جماعتی آرگن کہے خواہ ذاتی مفاد کے لئے خواہ حسد و رقابت سے، دوسرا لاکھ دلائل و شواہد پیش کرے، براہین کا انبار لگائے، ملک وملت کا مفاد بتلائے۔ جو "جماعتی امیر" نے کہہ دیا سو کہہ دیا، لاکھ دہائی ایک طرف "امیر" کی فرمائی ایک طرف ..... اگرچہ "جماعتی امیر" کی فکر و نظر کام نہیں کرتی اور علم و عقل ساتھ نہیں، یا وہ اپنے "بھانجے" بھتیجے اور بھائی بہن کے لئے ہی کچھ فرمائیں، بس جو "فرما دیا" فرما دیا۔ اب عقل و ادراک اور فہم و فراست کچھ کہے حالات و واقعات کچھ بھی پیش کریں، ملکی حالات اور ملکی مسائل کچھ ہوں ماننا وہی ہے جو جماعتی امیر نے کہا۔

نہیں یقین تو گزشتہ دنوں کے اخبارات ملاحظہ فرمائیں۔ کہ چند افراد کی طرف سے شریعت بل کے نام سے ایک بل پیش کیا گیا ہر صاحب شعور نے کہا کہ یہ ملک و ملت کے حق میں ضرر رساں اور اسلامی تعلیمات کے حق میں زہر قاتل ہے دلیلیں دیں شواہد پیش کئے مگر بل پیش کرنے والوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی بس اپنی دھن میں مست رہے بلکہ انہیں میں سے ایک جماعت کے امیر اتنے بوکھلائے کہ انہوں نے نام لے لے کر بے ایمانی اور کفر کے فتوے لگانے شروع کر دیئے محض اس لئے کہ (بھانجے بھتیجے) کسی طرح نقصان سے بچ جائیں۔ جب اس پر لعن طعن ہوئی تو فرمانے لگے میں نے کسی کا نام نہیں لیا۔ (نام سے تو چند ایک کا فر بنتے ہیں نام نہیں لیا تاکہ سارے بل نہ ماننے والے فتوے کی زد میں آجائیں) ان امیر صاحب کے "جماعتوں نے" اپنے امیر کی وکالت اسطرح کی کہ امیر صاحب نے تو کافر اور بے ایمان ہی کہا تھا انہوں نے تمام بازاری اصطلاحات لاگو کر دیں۔

۴۔ افیون اور جماعت اسلامی

ہفت روزہ الاسلام نے اپنی ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جماعت اسلامی سرحد کے ایک رہنما ڈاکٹر محمد یعقوب صاحب کا افیون کے حلال ہونے کے بارے میں روزنامہ جنگ لاہور کی ۳۰ ستمبر کی اشاعت سے یہ فتویٰ نقل کیا ہے اور اسے اپنے تبصرے کے ساتھ ان الفاظ میں شائع کیا ہے :۔

"میں حکومت کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ افیون کی کاشت غیر اسلامی اقدام ہے۔ انہوں نے کہا کہ افیون کی کاشت پیشہ ہے اور شہریوں کو ان کے پیشہ سے باز نہیں رکھنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے ایک راہنما ہونے کی حیثیت سے اپنی "جماعت" کی پالیسیوں کی وضاحت فرما کر مجھ پر احسان کیا ہے؟ کہ یہ "جماعت" سب اچھے ہیں" کا نعرہ بڑی سچائی سے بلند کرتی ہے اور پیشہ وروں کی معاون بھی ہے، کسی بھی "پیشہ کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ دفاع چاہتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان نے جہاں مجھ پر ایک احسان کیا ہے وہاں مجھے ایک الجھن میں بھی پھنسا دیا گیا ہے کہ معلوم نہیں افیون سے کیا مراد ہے؟ واقعتاً ہیروئن اور ہیرو بنانے والے افیون یا وہ فکری افیون جو یہ جماعت مدت سے عوام کو دے رہی ہے!

۵۔ جماعت اہلسنّت اور شریعت بل

جماعتِ اہلسنّت جو اپنے بریلوی مسلک کی وجہ سے مشہور ہے۔ ملک کے اٹھانوے فیصدی آبادی کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہے، اس جماعت نے ۲۶ اکتوبر ۸۶ء کو لاہور میں ایک جلسہ کیا جس کی کارروائی روزنامہ جنگ لاہور نے اپنی ۲۷ اکتوبر کی اشاعت میں اس سرخی کے ساتھ شائع کی:۔

"جماعتِ اہلسنّت نے بھی شریعت بل مسترد کر دیا" اور اس کے نیچے ذیلی سرخی میں جماعت کا یہ اعلان ہے کہ حکومت کا نواں ترمیمی بل بھی غیر واضح ہے۔ اس کے نیچے شریعت بل کو ان الفاظ میں مسترد کیا گیا ہے:۔

لاہور (نمائندہ جنگ) جماعتِ اہلسنّت پاکستان کے مرکزی اجلاس میں متفقہ طور پر پرائیویٹ شریعت بل کو مسترد کر دیا گیا ہے اور قرار دیا کہ یہ شریعت بل ایک ڈھونگ ہے اجلاس میں آزاد کشمیر سمیت دوسرے اضلاع سے بھی مندوبین نے شرکت کی بعد ازاں جماعتِ اہلسنّت پاکستان کے مرکزی صدر مفتی محمد مختار احمد نعیمی نے اس سلسلے کا اعلان کیا۔

۶۔ شریعت بل اور بریلوی علماء!

بریلوی مکتبِ فکر کے علماء نے مجوزہ شریعت بل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اسے اس مکتبِ فکر کے ترجمان پندرہ روزہ المصطفیٰ، گوجرانوالہ میں ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:۔

نام نہاد شریعتِ بل ناقابلِ قبول ہے۔

(مفتی مختار احمد نعیمی)

(اس کا باقی حصہ صفحہ (۲۴) پر ملاحظہ ہو)

ہے، بنابریں اللہ کے معنے ہوں گے اِلٰہِ حقیقی، اِلٰہِ واحد، جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے یہ (اللہ) اسمِ ذات ہے۔ یعنی یہ لفظ ذاتِ خداوندی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور باقی تمام الفاظ اس ذات کی صفات ہیں۔

(اِلٰہ) کے مادہ (ا۔ل۔ہ) میں حسبِ ذیل معانی مضمر ہوتے ہیں۔

۱:۔ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا پناہ دینا۔

۲:۔ متحیّر ہونا۔

۳:۔ بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا

۴:۔ کسی کی غلامی یا محکومیت اختیار کرنا۔ یعنی کسی کا غلبہ و اقتدار تسلیم اور قبول کرنا

ان معانی کی رو سے اللہ (یعنی قرآنی اِلٰہ) سے مراد وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔ جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جس کی اطاعت اور محکومیت ضروری ہے۔ یعنی اُسے الٰہ تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت و محکومیت اختیار کی جائے۔ جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم نہ کچھ جان سکتے ہیں نہ بتا سکتے۔ وہ انسانی عقل و شعور اور فکر و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶/۱۰۳) اُس کا ارشاد ہے۔ البتہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس ذات کی صفات کیا ہیں۔ اور یہ صفات بھی خود اسی کی بتائی ہوئی ہیں۔ جو قرآن کریم کے اندر مندرج اور محفوظ ہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ سے مراد ہوگا اس ذات کی حاکمیت و اقتدار تسلیم اور اختیار کرنا جس کی صفات قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔

اِلٰہ کا عالمگیر تصوّر

جیساکہ میں نے اپنی کتاب "من و یزدان" کے شروع میں کہا ہے۔ آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گذر جائیے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلالحاظِ زمان و مکان، بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی۔ یعنی بلند و بالا ہستی کا تصور۔ کسی فوق البشر قوت کا احساس جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے۔ جس سے مرادیں مانگی جائیں، جس سے ڈرا جائے، جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں۔ دنیا کے سیاح اور مغربی محققین اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں ان سے پہلے کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم تک دکھائی نہیں دئے۔ اور وہاں کے باشندے، تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا، ابتدائی دورِ جہالت کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور اندازِ معیشت و معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی، بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش

کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی ہستی کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا تصور یا تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ اور یہی وہ اختلافات ہیں جہاں ہر قبیلہ کا خدا، دوسرے قبیلہ کے خدا سے مختلف اور ہر مذہب کا معبود دوسرے مذاہب کے معبود سے جداگانہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی۔ یہ حقیقت سے بے خبری کی دلیل، فریب تخیل یا دانستہ تلبیس ہے۔ یہودیوں کا "یہوہ"۔ عیسائیوں کا "فادر"۔ ہندو دھرم کا "ایشور" یا ان کے ویدانت کا "پرماتما"۔ مجوسیوں کا "یزدان"۔ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ۔ یہ اس لئے کہ ان مذاہب کے بانیوں نے (جنہیں ہم زمرۂ انبیاء کرامؑ میں شمار کر سکتے ہیں، اگرچہ انبیاء کو دین کا بانی نہیں بلکہ دینِ خداوندی کے پہنچانے والے کہا جائے گا۔) خدا کی وہی صفات بیان کی ہوں گی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن بعد میں، ان میں انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش ہو گئی اور اس طرح مختلف مذاہب کے خدا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ بلکہ خدا کے حقیقی اور منزہ تصور سے بھی جداگانہ تصور کے پیکر بن گئے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۶/۱۰۰)

خدائے حقیقی

خدائے حقیقی (اللہ) ان صفات سے بلند و بالا تر ہے جنہیں ذہنِ انسانی نے تراش کر اس کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ خدا کا صحیح تصور انہی صفات کی رو سے سامنے آسکتا ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی خیالات اور تصورات کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان لوگوں کے ایمان باللہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور واضح طور پر کہتا ہے کہ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ جب اس نے کہا ہے کہ:۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱)۔ تو اس کے یہی معنی نہیں کہ ذاتِ خداوندی کو کسی مثال کے ذریعے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ مثال، بہر حال کسی محسوس اور محدود شے کی دی جائے گی اور اس کی ذات غیر مرئی اور غیر محدود ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ غیر مذاہب کے لوگ جن جن خداؤں کو مانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس خدا کی مثل نہیں جس کا تصور خود خدا نے دیا ہے۔ اور یہیں سے یہ نکتہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ لفظ "اللہ" کا ترجمہ کسی اور زبان میں

اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا ترجمہ جس زبان میں بھی کیا جائے گا تو اس سے اس خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ جسے اس زبان کے بولنے والے خدا مانتے ہیں۔ مثلاً

(GOD) کے لفظ سے عیسائیوں کے خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ اور "ایشور" کے لفظ سے ہندوؤں کے تصور کا خُدا۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اور اس کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ میں اسے نہیں مانتا۔ یا ایک شخص اُس خدا کو مانتا ہے جس کا تصور (مثلاً) عیسائیت پیش کرتی ہے۔ اور دوسرا اُس ذات کو جس کا تصور قرآن میں دیا گیا ہے، تو ان کی عملی زندگی پر اس سے کیا اثر پڑے گا؟ اس لئے کہ اگر کسی عقیدہ یا نظریہ کا اثر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا تو اس کا ماننا یا نہ ماننا یکساں ہے۔ اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے جسے میں نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں بیان کیا ہے، اس مقام پر اس کا ذکر اختصاراً کیا جاتا ہے۔

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے (اور اب دنیائے مذاہب کے علاوہ، علمائے نفسیات بھی اس کی شہادت دینے لگ گئے ہیں) کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں، جو دیگر حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور بالآخر موت کے ہاتھوں ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات، نفس یا (SELF) کہا جاتا ہے۔ یہ ذات، ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، لیکن غیر نشو و نما یافتہ شکل میں۔ موت کے ہاتھوں انسانی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ بغرضِ تفہیم ہم انسان کی طبیعی زندگی کو "حیوانی سطح کی زندگی" اور اس کی ذات کی حامل زندگی کو "انسانی زندگی" کہہ کر پکاریں گے۔

انسانی ذات

اس غیر نشو و نما یافتہ ذات کی نشو و نما، انسانی زندگی کا مقصود اور نصب العین ہے۔ نشو و نما یافتہ ذات، موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی قرآنی آیات کی رو سے اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گی) یہ حقیقت کہ ایک فرد کی ذات نشو و نما پا رہی ہے یا نہیں، اس کا صحیح صحیح طور پر علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ (تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں کی رو سے "تزکیۂ نفس" کا تصور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے) ذات اپنی مکمل ترین شکل میں ذاتِ خداوندی ہے، اور قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس کی صفات (یوں کہیئے کہ) اس سے منعکس ہونے والی شعاعیں یا اس کے مختلف گوشے (FACETS) ہیں۔ ان صفات کو چھوڑ کر جو صرف ذاتِ خداوندی کا خاصہ ہیں۔ (مثلاً ابدیت اور لامتناہیت وغیرہ) باقی صفات، محدود طور پر انسانی ذات کے اندر بھی بمضمر طور پر (POTENTIALLY) رکھ دی گئی ہیں۔ جوں جوں انسانی

ذات نشو و نما پاتی جاتی ہے، یہ صفات (بشری حدود کے اندر) منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس فرد کی ذات نشو و نما پا رہی ہو۔ اس کی سیرت و کردار میں (حدِ بشریت کے اندر) "صفاتِ خداوندی" کی نمود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننے کے لئے کہ ہماری ذات نشو و نما پا رہی ہے یا نہیں اور اگر پا رہی ہے تو کس حد تک، یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت و کردار میں "صفاتِ خداوندی" کی جھلک نظر آتی ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو صفاتِ خداوندی، ہماری ذات کی نشو و نما پانے کے لئے ایک خارجی معیار یا (OBJECTIVE STANDARD) کا کام دیں گی۔ اس سے انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو سکے گا۔ یہ ہے اللہ پر ایمان کی اولین ضرورت اور اس کا بنیادی مقصد

لیکن انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین و اقدار کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا کی ہیں اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کے "الٰہ" (صاحبِ اقتدارِ مطلق) ہونے پر ایمان سے یہی مقصود ہے خارجی کائنات میں ہر شے اُس مقصد کے حصول کے لئے جو اُس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے، قوانینِ خداوندی کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ کسی شے کو اس اطاعت سے مجالِ انکار نہیں، یارائے سرکشی نہیں۔ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ کی قوت حاصل نہیں ہے۔ انہیں اُن کی اطاعت کیلئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی پہلی اور پیش پا افتادہ شہادت تو یہ ہے کہ اگرچہ حیوانات کی طرح اس کی طبیعی زندگی کا مدار بھی قوانینِ فطرت کی اطاعت پر ہے۔ لیکن یہ ان کی اطاعت سے سرکشی برت کر، خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ حیوانات خودکشی نہیں کر سکتے۔

جس طرح انسان کی طبیعی (حیوانی سطح کی) زندگی کے لئے قوانین و ضوابط ضروری ہیں، اسی طرح اس کی انسانی زندگی (یعنی وہ زندگی جس میں اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے) کے لئے بھی قوانین و ضوابط لابدی ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو انسان کے لئے دوہرے ضوابط کی پابندی ضروری ہے ـــــ ایک ضابطہ اس کی طبیعی زندگی (بدن) کے قیام اور نشو و نما کے لئے اور دوسرا ضابطہ اس کی انسانی زندگی (ذات) کے استحکام اور برومندی کے لئے۔

اجتماعی زندگی

اس کی طبیعی (حیوانی) زندگی کا قیام اور نشو و نما تو انفرادی طور پر (اکیلے اور تنہا رہنے سے) بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشو و نما اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے، جہاں ایک انسان کا واسطہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ (یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما ـــــ تزکیۂ نفس ـــــ غاروں، پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں یا مراقبوں اور ریاضتوں کی خلوت گاہوں میں ممکن ہے، فریبِ نفس ہے۔ اور بہرحال قرآنی تعلیم کے خلاف۔) قرآنِ کریم کا تجویز کردہ پروگرام: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳)

قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنا۔ اور کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۹/۱۱۹) سچوں کی
کی معیت میں زندگی بسر کرنا، ہے۔ وہ "جنت" میں داخلہ کی شرط یہ بتاتا ہے کہ۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَادْخُلِیْ
جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹-۳۰) میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی
کہا جائے گا۔ لہٰذا انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ضابطۂ قوانین کی ضرورت لاینفک ہے۔ اس زندگی کے
لئے قوانین وضوابط کی ضرورت دنیا کی ہر قوم تسلیم کرتی ہے۔ انسانوں کے ایک گروہ (جن کی آج کل اکثریت ہے) کا
خیال ہے۔ کہ ان قوانین کو انسانی سوسائٹی خود وضع کر سکتی ہے۔ (اس نظریہ کو **سیکولرازم کہا جاتا ہے**) لیکن
قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اس سے انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔ (جیسا کہ تاریخ شاہد
ہے کہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور ہو رہا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے بھی اسی خدا کی طرف سے قوانین ملنے چاہئیں
جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ اور جن کی رو سے نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے
(۶۷/۳-۴) یہ قوانین وحی کی رو سے ملتے ہیں۔ اور اب اپنی مکمل، غیر متبدل صورت میں قرآن کے اندر محفوظ ہیں (۶/۱۱۴؛ ۱۵/۹)
سیکولرازم کے حامیوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اتنا تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا۔ اور اس میں اسی
کے قوانین کارفرما ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اسے ایمان باللہ (خدا پر ایمان) تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق وہ کہتا ہے
کہ "اگر ان سے پوچھو، کہ اس زمین اور اجرام فلکی کو کس نے پیدا کیا۔ اور شمس و قمر کس کے قوانین کے تابع سرگرم عمل ہیں تو
یہ کہیں گے کہ خدا ہی نے انہیں پیدا کیا اور اسی کے قوانین کے یہ تابعِ تسخیر ہیں"۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "اگر ان سے پوچھو کہ وہ کون
ہے۔ جس کے قوانین کے مطابق آسمان سے بارش ہوتی ہے جس سے زمینِ مردہ حیاتِ نو حاصل کر لیتی ہے، تو یہ کہیں گے
کہ ایسا خدا ہی کے قوانین سے ہوتا ہے"۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی
کو تسلیم کرتے ہیں تو انسانی دنیا میں اس کے قوانین کی ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں؟ یہاں پہنچ کر انہیں [illegible] بات
دھوکہ دیدیتی ہے۔ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۹) ان کی عقل و فکر پر کیوں پردے پڑ جاتے ہیں (۲۹/۶۱-۶۳) وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۹/۶۳)

ارض و سما کا الٰہ

حمدیتِ خداوندی کی آماجگاہ صرف خارجی کائنات نہیں۔ انسانی دنیا کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی مظہر بنے۔ تم انسانی دنیا کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس کے بعد دیکھو کہ یہاں کس طرح مسرتوں اور شادکامیوں کے چشمے ابلتے اور تحسین و آفرین کے غلغلے بلند ہوتے ہیں! وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو:

وَهُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴)

سما میں بھی وہی اِلٰہ ہے۔ اور ارض میں بھی وہی اِلٰہ۔

کائنات کی فضاؤں میں بھی اسی کا اقتدار کارفرما ہے اور زمین پر بھی اسی کا اقتدار۔ اللہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں اسی کے قوانین کی کارفرمائی کو تسلیم کیا جائے۔ اگر اللہ کو سمٰوٰت (خارجی کائنات) کا اِلٰہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم کر لیا جائے اور انسان اپنی تمدنی زندگی میں اور اِلٰہ تجویز کرلے، تو اس سے فساد برپا ہو جائے گا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور اِلٰہ تسلیم کر لیے جائیں تو ان میں فساد برپا ہو جائیگا۔

اپنے جذبات کو الٰہ بنا لینے والے

یہی نہیں کہ قرآن کریم انسانی سوسائٹی کے اپنے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے ہی کو ایمان باللہ کے منافی قرار دیتا ہے۔ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:-

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" (۴۵/۲۳)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا۔

ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵/۲۳) - انسان میں سننے، دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور یوں وہ علم رکھنے کے باوجود تباہیوں اور بربادیوں کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵/۲۳) ایسے شخص کو تباہی سے صرف خدا کی راہنمائی ہی بچا سکتی ہے۔

اس مقام پر ایک ایسا نکتہ سامنے آتا ہے جسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں اجمالاً اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ جب قرآن کا نزول ہوا تو ساری دنیا رہبانیت (خانقاہیت) میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس مسلک کی رُو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ انسانی جذبات معرفتِ خداوندی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور قربِ الٰہی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو جذبات کو فنا کر دے۔ اسی کا نام نفس کشی تھا۔ یہ مسلک انتہائی مہلک تھا۔ اول تو جذبات ہی وہ قوت ہیں جو انسانی عمل کے محرک بنتے ہیں۔ انہیں فنا کر دیا جائے تو انسان پتھر بن کر رہ جائے۔ دوسرے یہ کہ جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہے۔ جذبات کو صرف دبایا جا سکتا ہے۔ اور دبائے ہوئے جذبات جب اپنی

جذبات اور علم و ہدایت

تسکین و نمود کے لئے صحیح فطری راستے بند پاتے ہیں تو غیر فطری راستوں سے سر نکالتے ہیں۔ اسے علم النفس کی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) کہتے ہیں۔ جس سے انسان قسم قسم کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے آکر اس غلط مسلکِ خانقاہیت کو للکارا اور کہا کہ جذبات کو سرکش اور بیباک بنا دینا، ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ (اس کو وہ جذبات کو الٰہ (خدا) بنا لینے سے تعبیر کرتا ہے)۔ انہیں اگر ہدایت خداوندی کے تابع رکھا جائے تو ان سے بڑے بڑے تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) گمراہ اور تباہ کار وہ ہے جو ہدایتِ خداوندی کا بغیر جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے: بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹) ظالم وہ ہیں جو بغیر علم اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں۔

مسلکِ خانقاہیت میں علم و جذبات کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے قربِ خداوندی کا ہر مدعی عقل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جذبات سے علم کی روشنی میں کام لو۔ فکرِ انسانی کو اس (بظاہر متضاد) حقیقت تک پہنچنے کے لئے صدیاں درکار تھیں۔ چنانچہ اب بیسویں صدی میں علم النفس (PSYCHOLOGY) ایک سائنس کی حیثیت سے سامنے آرہا ہے (اگرچہ یہ ابھی باقاعدہ سائنس بن نہیں سکا۔) اس علم کے ماہرین نے، بڑی گہری تحقیق کے بعد جذبات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی (RATIONAL PASSIONS) اور (IRRATIONL PASSIONS)۔ یہ وہی تقسیم و تفریق ہے جس کی طرف قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ اور جسے اس سے پہلے فکرِ انسان اپنا نہیں سکا تھا۔ وہ علم اور جذبات کو نقیضین (متضاد عناصر) قرار دیتا تھا۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں پہنچکر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قرآن فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔

بہر حال قرآن کریم نے خدا کی اُلوہیت (اقتدارِ خداوندی) کو ایسی بلند اور منزہ سطح پر رکھا ہے کہ وہ اور تو اور، انسانی جذبات کو "خدا" بنا لینے کو بھی شرک قرار دیتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، دونوں کو قوانین خداوندی کے تابع رکھے یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے تھے۔ اور اب اس کی کتاب، قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی کو خدا کی حاکمیت تسلیم کرنا کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ اس نے نہایت جامع الفاظ میں کہدیا کہ:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۵)

جو اپنے تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اُس کی کتاب کے تابع زندگی بسر کریں، وہی خدا کو اِلٰہ ماننے کے مدعی ہو سکتے ہیں۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱/۱)

سورۃ فاتحہ میں ان دو لفظوں کے بعد اللہ تعالٰے کی تین صفتوں کا بیان متعین طور پر کیا گیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی حمدیت کا ظہور اور اس کی نمود بنیادی طور پر ان صفات کی رُو سے ہوگی۔ وہ صفات ہیں: رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ"۔ اور "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ"۔ سب سے پہلے لفظ ربّ کو لیجئے:

ربّ (ر۔ ب۔ ب) کے بنیادی معنے ہیں "نشو و نما دینا"۔ یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے اور اس طرح گذارنا کہ وہ بتدریج نشو و نما پاتی ہوئی، اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ "طریقِ نشو و نما" ربوبیت کہلاتا ہے۔ اور اس طرح نشو و نما دینے والے کو "رب" کہا جاتا ہے۔ اس طریق میں اصلاح، درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ نشو و نما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے "اَلرِّبَّةُ"، ان پودوں کو کہتے ہیں جن کی سرسبزی اور تازگی، سردی اور گرمی ہر موسم میں یکساں رہتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے "رَبٌّ" کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی نشو و نما دینے والا۔ پایۂ تکمیل کو پہنچانے والا۔ انتظام کرنیوالا، اصلاح کرنے والا، آگے بڑھانے والا اور استحکام عطا کرنے والا، یعنی ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچانے والا۔

تخلیق کائنات یہ محسوس کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی، اس کا جواب فکرِ انسانی سے ممکن نہیں نظامِ فطرت میں قانونِ علت و معلول (LAWS OF CAUSE AND EFFECT.) جاری و ساری ہے یعنی یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبیعی سائنس، علت اور معلول کی کڑیوں کے دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ محققین ان کڑیوں کو پیچھے لئے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس تحقیق میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں، لیکن اس میں وہ آخرالامر ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یہ کائنات تو موجود نظر آتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح وجود میں آگئی۔ یعنی وہاں (EFFECT) تو موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کے (CAUSE) کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس مقام پر اسی طرح دانتوں میں انگلی دبائے محوِ حیرت کھڑا دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔ ہم نے ("اللہ" کے عنوان میں) دیکھا ہے کہ "اِلٰہ" کے معانی میں متحیر ہو جانا بھی شامل ہے آغاز

(جاری ہے)